سی پارہ دل حصہ دوم
کانا باتی
خواجہ حسن نظامی کی ریڈیو تقریریں
پہلا ایڈیشن قیمت ایک

کتاب کانا باتی
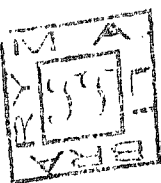
سی پارۂ دل کا دوسرا حصہ

مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کی وہ تقریریں جو دلی ریڈیو کے ذریعہ تمام دنیا کے

کانوں نے سنیں

میں انسان - اللہ کی قدرت پر قربان - جس نے مجھے علم دیا اور عقل دی - اور میں نے اپنی عقل اور علم کے زور سے ریڈیو بنایا - اور ریڈیو کے کان میں (میکروفون میں) جو بات کہی وہ ساری دنیا نے سن لی -

جب میں دلی ریڈیو اسٹیشن کے ایک اکیلے کمرہ کے اندر کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں تو میرے منہ کے سامنے ہاتھ کی ہتھیلی کی برابر ایک جالی دار چیز لگا دیتے ہیں جس کے اندر میری آواز جاتی ہے - اور پھر تاروں کے ذریعہ اس بجلی گھر میں پہنچتی ہے جہاں بجلی کی کلیں لگی ہوئی ہیں وہ کلیں بجلی کی لہروں کے پروں پر میری آواز کو بٹھا کر ساری دنیا میں پھیلا دیتی ہیں پہاڑوں میں - جنگلوں میں - دریاؤں میں - شہروں میں - ہر جگہ میری آواز جاتی ہے - میری آواز سورج کی دھوپ اور چاند کی چاندنی اور ہوا کی طرح ہر جگہ پہنچ جاتی ہے - بلکہ سورج کی دھوپ وہاں نہیں جاتی جہاں آڑ ہو - اور چاندنی بھی وہاں نہیں جاتی جہاں چاند سے حجاب ہو - اور ہوا بھی وہاں نہیں پہنچ سکتی جہاں روک ہو - مگر میری آواز کو کوئی پہاڑ کوئی دیوار اور کوئی ٹھوس چیز نہیں روک سکتی - اور میں عاجز بندہ حیران ہو کر کہتا ہوں کہ مجھے اپنے خالق خدا کی نسبت شک و شبہ ہوتا تھا کہ وہ ہر جگہ کیونکر ہو سکتا ہے کیونکہ وہ تو ایک ذات ہے اور جہاں وہ

ذات ہے بس وہیں ہوتی ہو گی۔ ہر جگہ کیسے ہو سکتی ہے۔ مگر اپنی آواز کو ہر جگہ پہنچتا دیکھ کر مجھے ماننا پڑتا ہے کہ خدا بھی ہر جگہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب اُس کے پیدا کئے ہوئے آدمی کی آواز اُس کی عقل اور حکمت کے زور سے ہر جگہ پہنچ سکتی ہے۔ تو خدا تو پھر آخر خدا ہے۔

مگر شرط یہ ہے کہ سُننے والوں کے پاس کان بھی ہوں۔ میں انگریزی عقل والوں سے کہتا ہوں کہ خدا کو ہر جگہ دیکھ سکتے ہو اگر تمہارے آنکھیں بھی ہوں۔ اور تم خدا کی آواز ہر جگہ سُن سکتے ہو اگر تمہارے پاس کان بھی ہوں" تو وہ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہمارے تو کان بھی ہیں۔ اور آنکھیں بھی ہیں۔ مگر خدا نہ دکھائی دیتا ہے۔ نہ اُس کی آواز سنائی دیتی ہے

میں بھی آج یہ کہہ سکتا ہوں کہ جس کے پاس ریڈیو مشین نہ ہو وہ میری آواز نہیں سُن سکتا۔ حالانکہ میری آواز ہر جگہ جاتی ہے۔ پس تمہاری آنکھ اور تمہارے کان جو خدا کو دیکھ سکیں اور خدا کی آواز سُن سکیں دل کی مشین کی صورت میں درکار ہیں۔ اپنے دل کو خدا کی طرف لگالو تو خدا کو دیکھ سکو گے۔ اور خدا کی آواز سُن سکو گے۔

میں نے دِلّی ریڈیو میں بہت سی تقریریں کی تھیں۔ اور اُن کو ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے لاکھوں آدمیوں نے سُنا تھا۔ یہاں تک کہ جب میں نے پہلی تقریر ریڈیو میں کی تو مجھے بخار چڑھا ہوا تھا۔ اِس تقریر کو سُن کر حیدر آباد سے ایک خط آیا کہ آپ کی آواز سے محسوس ہوتا تھا کہ شاید آپ کو بخار تھا۔

حیدر آباد دلّی سے ایک ہزار میل دور ہے۔ تو گویا ایک ہزار میل کے فاصلہ پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے میری آواز کی نبض سے میرا بخار پہچان لیا۔ تو کیا میں دس بیس کروڑ میل دور بیٹھے ہوئے خدا کی مخفی مشیّتوں اور مرضیوں کو نہیں سمجھ سکتا؟

آج میں ریڈیو دہلی میں کی ہوئی اپنی تقریروں کو اس کتاب میں جمع کر کے شائع کرتا ہوں جو غالباً سب نہیں ہیں۔ کیونکہ بعض تحریروں کو محفوظ نہ رکھا جا سکا تھا۔ تاہم جو تقریریں دستیاب ہو سکیں اُن کو دِلّی ریڈیو اسٹیشن کی اجازت سے شائع کیا جاتا ہے۔ چونکہ اِن تقریروں کا معاوضہ

ریڈیو اسٹیشن سے مجھے ملا تھا۔ اِس واسطے اِن تقریروں کا پہلا حق دلّی ریڈیو کا تھا۔ مگر قانوناً اِن تقریروں کا اصلی مالک میں ہی ہوں۔ کیونکہ جو معاوضہ مجھے دیا گیا اُس کی مقدار اتنی قلیل تھی۔ کہ اُس کو ریڈیو میں صرف ایک بار سنا دینے کا معاوضہ کہا جا سکتا ہے۔ تاہم میں نے شروع میں ہر تقریر کی اشاعت کی اجازت ریڈیو اسٹیشن سے حاصل کی تھی۔

یہ تقریریں اردو زبان کے ایک مخصوص طرز تحریر اور طرز تقریر کا نمونہ ہیں۔ قدرت نے میری آواز بھی ریڈیو کے لئے موزوں بنائی ہے۔ اور میرے بولنے کا طریقہ بھی قدرتاً ایسا ہے جو ناپسند نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ میں نے کبھی ریڈیو میں تقریر کرنے کے فن کو سیکھا نہ تھا۔ نہ کبھی کسی تقریر کی ریڈیو میں سنانے سے پہلے مشق کی تھی۔ بلکہ اتفاقاً اور قدرتاً میرا طرز تقریر، ریڈیو کی شعاعوں کو پسند آگیا۔ اور سننے والے بھی پسند کرنے لگے۔ یہاں تک کہ بعض بولنے والوں نے جو ریڈیو میں تقریریں کیا کرتے ہیں۔ میرے طرز تقریر کی تقلید شروع کردی۔

میں ایک پکا غیر مقلد ہوں۔ یعنی کبھی کسی تحریر اور تقریر میں کسی محرر اور کسی مقرر کی تقلید نہیں کیا کرتا۔ اور ریڈیو کی تقریروں میں بھی میں نے کسی کے لہجہ اور کسی کے طرز کی تقلید نہیں کی بلکہ ہمیشہ یہ کوشش کی کہ کسی دوسرے بولنے والے سے میرے طرز تقریر کی مشابہت نہونے پائے۔

البتہ مولانا آزاد دہلوی میرے معنوی اُستاد تھے۔ یعنی اُن کی تحریروں کو دیکھ دیکھ کر میں نے لکھنا سیکھا تھا۔ تو ریڈیو میں مولانا آزاد کے پوتے آغا محمد اشرف صاحب ایم۔اے میرے معنوی ماسٹر کہے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ جب وہ ریڈیو میں اناؤنسر تھے تو اُن کا لہجہ اور طرز مجھے بہت پسند تھا۔ اِس لئے شاید اُن کے طرز نے مجھ پر کچھ اثر کیا ہو۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ میں نے تقلید اُن کی بھی نہیں کی۔

کانا باقی نام میں مضامین کے عنوان اور کتابوں کے نام رکھنے میں کمال رکھتا ہوں۔ اگرچہ میرے بعض عنوان اور کتابوں کے نام چھچھورے کہے جاتے ہیں اور بھاری بھرکم اور باوقار لوگ ان کو وقعت سے نہیں دیکھتے۔ مگر میں اُن کی وقعت کرنے کا محتاج ہونا نہیں چاہتا وہ قیمت

کریں یا نہ کریں میں جس آنے والے زمانہ کے لئے یہ جدتیں کرتا ہوں وہ ان ہی چیزوں کی قدر کرے گا۔ اور موٹے موٹے عربی فارسی کے لغت اُس کو پسند نہیں آئیں گے۔

پس میں نے اس کتاب کا نام کانا باتی رکھ دیا۔ کیونکہ یہ تقریریں درحقیقت لاکھوں کانوں نے سُنی ہیں۔ اور لاکھوں کانوں کو سُنانے کے لئے ریڈیو والوں نے مجھ کو اپنے ہاں بُلا کر یہ تقریریں کرائی تھیں۔ اس لئے ان کو **کانا باتی** کہا جا سکتا ہے۔

میرے مضامین کا ایک مجموعہ بیس سال پہلے **سی پارۂ دل** کے نام سے شائع ہوا تھا جو اَب بعض یونی ورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ اب یہ مجموعہ "سی پارۂ دل" کے دوسرے حصّہ کی صورت میں شائع کیا جاتا ہے۔

میں نے ریڈیو سب سے پہلے مولوی میر محبوب علی صاحب خلف نواب اعظم یار جنگ بہادر کے ہاں دیکھا تھا۔ جس کو پندرہ سال کا عرصہ ہوا۔ پھر جب حیدر آباد میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو مولوی میر محبوب علی صاحب اُس کے منتظم مقرر ہوئے۔ اور میں نے اپنی زندگی میں پہلی دو تقریریں اسی حیدر آباد کی اسٹیشن میں کی تھیں۔ اُس وقت دہلی میں اسٹیشن قائم بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد جب دہلی میں اسٹیشن بن گیا تو یہاں پہلی تقریر **گل بانو کی کہانی** ہوئی تھی۔ یہ ظاہر کر دینے کے بعد یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ میں نے اِن تقریروں کی ترتیب میں مقدم و مؤخر کا خیال نہیں کیا۔ کیونکہ پڑھنے والوں کو مضمون درکار ہوتے ہیں۔ وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ پہلی تقریر کون سی ہوئی۔ اور اُس کے بعد کون کون سی ہوئیں۔

اس کے علاوہ یہ تقریریں جن اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئی تھیں وہ سلسل نہیں ملے تھے۔ اس لئے ترتیب نہ ہو سکی۔ آئندہ ایڈیشن میں مرتب کر دی جائیں گی۔

حسن نظامی دہلوی

جون ۱۹۳۷ء

گل بانو کی کہانی کی تمہید

۲ر دسمبر ۱۹۳۵ء کی شام کو میں نے دہلی ریڈیو میں دنیا کو دہلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ کی پوتی گل بانو کا قصہ سنانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس شام مجھے ایک سو تین ڈگری بخار تھا۔ مگر وعدہ کی پابندی کے خیال سے میں گھر سے چلا۔ اور دس میل کا سفر کر کے ریڈیو اسٹیشن میں پہنچا۔ اور تقریر کی۔ بعد میں معلوم ہوا۔ کہ ریڈیو مشین خراب ہو جانے کے سبب کہانی پوری نہیں سنی گئی۔ اس لئے آج مکرر سنانے آیا ہوں۔

پہلی رات جب میں یہاں آیا۔ تو بخار کے سبب راستہ میں ایسا معلوم ہوا۔ کہ دنیا کے اونچے اونچے پہاڑ اور بڑے بڑے سمندر اور آسمان پر پانچویں رات کا چاند میری کہانی سننے کے مشتاق ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ انسان تو گانے اور باجے کا شوق رکھتے ہیں۔ مصیبت کی کہانیوں کو وہ نہیں ہم سننا چاہتے ہیں۔

پہاڑوں نے کہا "ہم بہت اونچے ہیں۔ اور ہم نے سنا تھا کہ چنگیز اور تیمور کی اولاد بھی اونچا ہونے کا دعویٰ کرتی تھی۔ آج اس دعوے کا انجام سننا ہے۔ تاکہ ہم بھی اونچا ہونے کا گھمنڈ ترک کر دیں۔ اگر یہ معلوم ہو کہ چنگیزی اور تیموری پست اور نیست ہو گئے۔"

سمندروں نے کہا "ہم بہت بڑے ہیں۔ زمین سے بھی زیادہ۔ لیکن سنا تھا۔ کہ مغلوں کی شان بھی بہت بڑی تھی۔ اگرچہ اُن کا جہاز ڈوب گیا۔ مگر ہم نے اُس کا ڈوبنا نہ دیکھا کیونکہ اُن کا سفینہ کنارہ پر ڈوبا تھا۔ آج معلوم کرنا ہے۔ کہ کیا بڑے بول کا سر نیچا ہوتا ہے؟"

چاند نے کہا "مجھے بھی شاہجہاں اور محمد شاہ رنگیلے کی پوتی کا قصہ سننا ہے۔ کیونکہ لال قلعہ میں شاہجہاں اور محمد شاہ نے مہتابی جشن بہت خوب کئے تھے۔ اور میری

چاندنی نے کبھی ایسی بہار نہ دیکھی تھی۔ آج سنوں گا کہ ان جشن منانے والوں کا چراغ کیونکر بجھا اور گُل ہوا ؟ تاکہ میں بھی اپنی چمک دمک کا غرور نہ کروں۔ اور چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات' پر غور کیا کروں۔

جب میری موٹر لال قلعہ کے پاس سے گزری تو اُس کی زبان حال بھی میرے کان میں آئی اور اُس نے کہا "کہ تم وائرلیس میں کہانی کہو گے۔ میرے اندر بھی چار کھمبے وائرلیس کے ہیں۔ گُل بانو میرے ہی اندر پیدا ہوئی، پلی اور بڑی ہوئی تھی۔ اب وہ کہاں ہے ؟ یہ معلوم کرتے آنا۔

جب میں کہانی کہہ کر گھر میں آیا تو سنا۔ کہ آدھی کہانی سُنی تھی کہ نئی دہلی کی بجلی آہ اور آف کہہ کر آف ہوگئی۔ اور گُل بانو کے غم میں بجھ گئی۔ میں نے کہا۔ "ماجرا ہی ایسا تھا۔ کہ ریڈیو مشین اور دھلی کا برقی کرنٹ اُس کو برداشت نہ کر سکے۔ مگر دیکھو اِس آدمی کو کہ سب کچھ برداشت کر لیتا ہے اور دوبارہ سُننا چاہتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ حسن نظامی کو دوبارہ بلاؤ۔

آج پھر آیا ہوں۔ اور پھر اِس درد بھرے قصّہ کو دُہراتا ہوں۔ سُننے والے دل لگا کر سُنیں۔

گُل بانو کی داستان

شہزادہ مرزا دارا بخت بہادر شاہ کے پہلے ولی عہد تھے۔ جو ۱۸۴۹ء میں غدر ۱۸۵۷ء سے آٹھ برس پہلے مر گئے تھے۔ اُن کی ایک لڑکی گُل بانو تھی جو ڈومنی کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ اور بہت خوبصورت تھی۔ یہ قصّہ اُسی گُل بانو کا ہے۔ جو غدر ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں سے برباد ہو کر اپنے باپ کی قبر پر چلی گئی جو درگاہ چراغ دہلی رضؓ میں تھی یہ درگاہ نئی دہلی سے جنوب میں تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور اسی درگاہ میں نمونیہ کی

بیماری سے مرگئی - اور وہیں دفن ہوئی - اب اُس کا قصہ سُنیئے جو بالکل سچا واقعہ ہے -
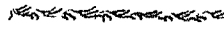
گُل بانو خدا رکھے پندرہ برس کی ہوئیں - جوانی کی راتوں نے گود میں لینا شروع کیا - مرادوں کے دن پہلو میں گدگدیاں کرنے لگے - یہ مرزا دارا بخت بہادر ولی عہد اول بہادر شاہ کی نورچشم ہیں - باپ نے اِن کو بڑے چاؤ اور چوچلے سے پالا ہے - اور جس دن سے وہ دنیا کو چھوڑ کر قبر میں گئے محل میں گُل بانو کی ناز برداریاں پہلے سے بھی زیادہ ہونے لگیں - اماں کہتیں نگوڑی کے ننھے سے دِل کو باپ کے مرنے کا بہت صدمہ پہنچا ہے - باپ کا کھٹکا نہ کرے - اِس کی ایسی دل داری کرو کہ اُن کی محبتوں کو بھول جائے -

اُدھر دادا یعنی بہادر شاہ بادشاہ کا یہ عالم تھا - کہ پوتی کے لاڈ پیار میں کسی بات کی کمی نہیں ہونے دیتے تھے - جو مانگتی تھی دیتے تھے - جو چاہتی تھی فوراً پورا کراتے تھے - اور شاہی محلوں میں گُل بانو کی دھوم تھی - کہ جہاں پناہ سب سے زیادہ گُل بانو کو چاہتے ہیں - اور اُس کے سامنے اپنی محبوب ملکہ زینت محل کے لڑکے جواں بخت بہادر کی اُلفت کو بھی بھول گئے ہیں -

پس ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ گُل بانو کس شان اور کس شوکت اور کیسے آرام اور کتنے عیش سے زندگی بسر کرتی ہوں گی - اور اُن کو ساری دنیا اپنی لونڈی معلوم ہوتی ہوگی -

اگرچہ مرزا دارا بخت مرحوم کے اور بھی کئی بچے تھے - مگر گُل بانو اور اُس کی والدہ سے تو اُن کو عشق تھا - گُل بانو کی ماں ایک ڈومنی تھی - مگر مرزا اُس کو تمام بیگمات سے زیادہ چاہتے تھے -

جب مرزا دارا بخت کا انتقال ہوا تو گُل بانو ۱۲ سال کی تھی - اور ہر مہینہ کی نوچندی جمعرات کو اپنی ماں کے ساتھ درگاہ حضرت چراغ دہلیؒ میں اپنے باپ کی قبر پر جایا

کرتی تھی۔ وہاں باتی تو باپ کی قبر کو لپٹ جاتی اور خوب روتی ۔اور کہتی ۔ابا حضرت آپ کہاں چلے گئے؟ ہم کو بھی اپنے پاس بلا لیجئے۔ہم بھی آپ کے پاس لیٹیں گے۔ہم آپ کو روز یاد کرتے ہیں۔اور ہمارا دل آپ کے بغیر گھر میں نہیں لگتا۔ماں کہتی۔بیٹی! دور پار۔دشمن مدعی۔ایسی بات نہیں کہا کرتے۔نوج۔خدا کرے جو تم ابا کے پاس جاؤ۔ابھی تم نے دنیا کا دیکھا ہی کیا ہے۔میرے اندھیرے گھر کا بس تم ہی ایک چراغ ہو۔ایسی بدفالی کی باتیں زبان سے نہ نکالو۔میرا دل ہلا جاتا ہے۔خدا تمہارے سہرے کی گھڑی دکھائے۔پھلو۔پھولو۔شاد رہو۔آباد رہو۔ابا حضرت بہشت میں ہیں۔اور بہشت کی کھڑکی سے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔تم جی ہلکا نہ کرو۔وہ بھی تم کو بھولے نہیں ہیں۔اور ہمیشہ تم کو یاد کرتے ہیں۔جنت کے اندر تمہارے لال قلعہ اور اس کے باغ سے بھی اچھے محل اور باغ ہیں۔

گل بانو کہتی۔تو اچھا بولتے کیوں نہیں؟ ہم سے بات کیوں نہیں کہتے؟ کیا انھوں نے قبر کے اندر کسی اور کو بیٹی بنا لیا ہے؟ یا جنت کی کسی حور کی لڑکی ان کی بیٹی بن گئی ہے؟

جوانی اور محبت گل بانو نے پندرھویں سال میں قدم رکھا۔تو شباب نے بچپن کی ضد اور شرارتیں تو رخصت کر دیں۔مگر دل ربائی کی شوخیاں اس قدر بڑھا دیں۔کہ محل کا بچہ بچہ گل بانو سے پناہ مانگتا تھا۔

گل بانو سنہری چھپر کھٹ میں دوشالہ تانے سویا کرتی تھیں۔شام کو چراغ جلے اور بانو کو نیند آئی۔اور سیدھی چھپر کھٹ میں پہنچیں۔ماں کہتی "چراغ میں بتی پڑی۔لاڈو پلنگ چڑھی"۔ تو گل بانو مسکرائی۔اور جمائی لے کر سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو ماتھے سے سمیٹ کر کہتی۔اچھا بی تم کو کیا؟ سوتے ہیں وقت کھوتے ہیں۔تمہارا کیا لیتے ہیں۔تم ناحق کونوں پر لوٹی جاتی ہو۔

ماں کہتی "نا بو۔میں جلتی نہیں۔شوق سے آرام کرو۔خدا تم کو ہمیشہ سکھ کی نیند

سُلا تا رکھے۔ میرا مطلب تو یہ تھا۔ کہ زیادہ سونا آدمی کو بیمار کر دیتا ہے تم شام کو جلدی سو جاتی ہو تو صبح ذرا جلدی اٹھا کرو۔ مگر تمہارا تو یہ حال ہے کہ دس بج جاتے ہیں گھر میں دھوپ پھیل جاتی ہے۔ لونڈیاں ڈر کے مارے بات تک نہیں کر سکتیں کہ بانو کی آنکھ کھل جائے گی۔ ایسا بھی کیا سونا۔ آدمی کو کچھ گھر کا کام بھی دیکھنا چاہئے۔ اب ماشاء اللہ تم جوان ہوتیں۔ پرائے گھر جانا ہے۔ اگر یہی عادت رہی تو وہاں کیونکر گزارہ ہوگا؟

گُل بانو! ماں کی یہ باتیں سُن کر بگڑتی۔ اور کہتی "تم کو ان باتوں کے سوا کچھ اور بھی کہنا آتا ہے۔ ہم سے نہ بولا کرو۔ تمہیں ہم دوبھر ہو گئے ہیں تو صاف صاف کہہ دو۔ ہم اپنے دادا حضرت (بہادر شاہ) کے پاس جا رہیں گے۔ اُن کو ہم دوبھر نہیں ہیں۔ وہ تو ہم کو اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتے ہیں۔ اور ہم کو ہاتھوں چھاؤں رکھتے ہیں۔ اتنا پیار تو وہ کسی سے بھی نہیں کرتے۔ کل چچا جواں بخت کو ہٹا کر مجھے پاس بٹھا لیا تھا۔

ماں کہتی۔ بیٹی ناحق بگڑتی ہو۔ تمہارے ہی بھلے کی بات کہی تھی۔ بے شک تمہارے دادا حضرت تم کو بہت چاہتے ہیں۔ مگر میں بھی تمہاری ماں ہوں۔ مجھ سے زیادہ تمہارا چاہنے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔

محبت اُسی زمانہ کا ذکر ہے کہ مرزا داور شکوہ شہزادہ خضر سلطان کے بیٹے گُل بانو کے پاس آنے جانے لگے۔ لال قلعہ دہلی کے شاہی خاندان میں باہمی پردہ کا دستور نہ تھا یعنی شاہی خاندان کے آدمی آپس میں پردہ نہ کرتے تھے۔ اِس واسطے مرزا داور بے روک ٹوک گُل بانو کے گھر میں آتے جاتے تھے۔ اور گُل بانو اُن سے پردہ نہ کرتی تھیں۔

پہلے تو گُل بانو اُن کی بہن اور مرزا داور اُن کے چچا زاد بھائی تھے۔ اور چچا تایا کے دو بچے سمجھے جاتے تھے۔ لیکن بعد میں عشق نے ایک اور رشتہ پیدا کیا۔ مرزا داور گُل بانو کو کچھ اور سمجھتے تھے۔ اور گُل بانو داور کو اس قرابت کے سوا کسی اور رشتہ کی نظر سے دیکھتی تھیں۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ صبح کے وقت مرزا داور گُل بانو کے پاس آئے تو دیکھا کہ بانو کالا دوشالہ اوڑھے سنہری چھپر کھٹ میں سفید پھولوں کی سیج پر پاؤں پھیلائے بے خبر پڑی سوتی ہیں۔ منہ کھلا ہوا ہے۔ اپنے ہی بازو پر سر رکھا ہوا ہے تکیہ الگ پڑا ہے۔ دو لونڈیاں پاس کھڑی مکھیاں اڑا رہی ہیں۔

داور شکوہ گُل بانو کی ماں یعنی اپنی چچی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ مگر کن انکھیوں سے گُل بانو کا یہ عالم مخموری و بے خودی دیکھتے جاتے تھے۔ آخر نہ رہا گیا۔ اور بولے :-

کیوں چچی حضرت! بانو اتنے دن چڑھے تک سوتی رہتی ہیں۔ دھوپ قریب آگئی۔ اب تو ان کو جگا دینا چاہیے۔

چچی نے جواب دیا " بیٹا کیا بتاؤں تم بانو کے مزاج کو جانتے ہو۔ کس کی شامت آئی ہے جو اُن کو جگائے۔ آفت برپا ہو جائے گی۔ ہر ماما اصیل کوڑے کھائے گی۔

مرزا داور نے کہا " دیکھیے میں جگاتا ہوں۔ دیکھوں کیا کرتی ہیں " چچی ہنس کر کہنے لگیں " جگا دو۔ تم سے کیا کہیں گی۔ تمہارا تو بہت لحاظ کرتی ہیں۔ داور نے گُل بانو کے چھپر کھٹ کے پاس جا کر گُل بانو کے تلوے میں گُدگُدیاں کیں۔ بانو نے انگڑائی لے کر پاؤں سمیٹ لیا۔ اور بے اختیار آنکھیں کھول کر نگاہِ طیش سے پائنتی کی طرف دیکھا۔ اُن کو خیال تھا کہ اُن کی کسی لونڈی نے یہ شرارت کی ہے۔ اُس کو گستاخی کی سزا دینی چاہیے۔

مگر جب اُنھوں نے ایسے شخص کو سامنے کھڑا دیکھا جس سے خود بخود اُن کا دل محبت کرتا تھا تو شرم سے اُنھوں نے دوشالہ کا آنچل اپنے چہرہ پر ڈال لیا۔ اور گھبرا کر اُٹھ بیٹھیں۔

داور نے اِس ہوش بائش منظر کو دل تھام کر دیکھا اور بے اختیار ہو کر کہنے لگے۔ لو چچی حضرت میں نے بانو کو اٹھا بٹھایا۔

آخر محبت نے اتنی ترقی کی کہ قلعہ میں چرچے ہونے لگے تو گل بانو کی ماں نے مرزا دادر شکوہ کا اپنے گھر آنا بند کرا دیا۔ اور اس روک ٹوک کے سبب ان دونوں کے جذبات محبت بہت بڑھ گئے۔

غدر کے نو مہینے بعد گل بانو اور مرزا دادر کے ہجر و فراق کا زمانہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ مرزا خضر سلطان اور اُن کے بیٹے مرزا دادر اور بادشاہ وغیرہ لال قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرہ میں چلے گئے۔ بادشاہ وہاں سے لال قلعہ میں لائے گئے۔ اور مرزا خضر سلطان اور اُن کے بھائی بیٹے دہلی کے موجودہ جیل خانہ کے سامنے باغی فوج کی سرداری کے جرم میں قتل کئے گئے۔ اور گل بانو کی ماں دہلی فتح ہونے سے پہلے ہیضہ کر کے مر گئیں اور گل بانو جنگلوں میں ماری ماری پھرتی رہیں۔ آخر بے کسی اور بے وارثی کی حالت میں درگاہ حضرت چراغ دہلیؒ میں آئیں جہاں اُن کے باپ مرزا دارا بخت کی قبر تھی۔

درگاہ حضرت چراغ دہلیؒ کے ایک کونہ میں ایک قبول صورت عورت پھٹا ہوا کمبل اوڑھے رات کے وقت خاک کے بستر پر پڑی ہوئی ہائے ہائے کر رہی تھی۔ سردی کے موسم کی بارش زور شور سے ہو رہی تھی۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے بارش کی بوچھاڑ اس جگہ کو تر کر رہی تھی جہاں یہ عورت نمونیہ کے سخت بخار میں بے ہوش لیٹی تھی۔

پسلی کا درد۔ بخار اور سردی اور گرم لباس کا نہ ہونا۔ اور گیلی زمین پر بغیر کسی بچھونے کے لیٹنا اس عورت کے لئے قیامت سے کم نہ تھا۔ آخر بخار کی بے ہوشی میں اس عورت نے آواز دی "گل بدن۔ اری او گل بدن۔ مردار مر گئی۔ جلدی آ۔ مجھے دوشالہ اوڑھا دے۔ دیکھ بوچھاڑ اندر آتی ہے پردہ چھوڑ دے۔ نہیں آتی۔ گل بدن نہیں آتی۔

پھر بولی "روشنک تو ہی آ۔ گل بدن تو کہیں غارت ہو گئی۔ میرے پاس کوئلوں کی انگیٹھی لا۔ پسلی پہ تیل مل۔ ارے درد سے میرا سانس رکا جاتا ہے۔ جب کوئی بھی یہ آواز سنکر عورت کے پاس نہ آیا تو اس نے کمبل چہرہ سے ہٹایا اور چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرے دالان میں خاک کے بچھونے پر اکیلی پڑی تھی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا مینہ سناٹے سے برس رہا تھا۔ بجلی چمکتی تھی

تو ایک سفید قبر کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ جو اُس کے باپ کی قبر تھی۔ یہ حالت دیکھ کر اُس عورت نے ایک آہ کا نعرہ مارا۔ اور کہا "بابا میں تمہاری گُل بانو ہوں۔ دیکھو اکیلی ہوں۔ اٹھو مجھے بخار ہے۔ ہائے میری پسلی میں درد بھی ہے۔ اور مجھے سردی بھی لگ رہی ہے۔ اور میرے پاس سوائے اِس بوسیدہ کمبل کے اوڑھنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ میری اماں کہاں ہیں؟ وہ بھی قبر میں جا سوئیں۔ میں شاہی محلوں سے جلا وطن ہو گئی۔ بابا۔ بابا۔ آج میں پھر کہتی ہوں کہ اپنی قبر میں مجھے بلا لو۔ آج اماں نہیں ہیں جو مجھے بدشگونی کی بات سے روکیں گی۔

ابا۔ مجھے اِس اندھیرے میں بادل کی کڑک اور بجلی کی چمک سے ڈر لگتا ہے۔ کفن سے منہ نکالو اور مجھے دیکھو۔ میں نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا۔ میرے بدن میں اس گیلی زمین کے کنکر چبھتے ہیں۔ میں اینٹ پر سر رکھے لیٹی ہوں۔ میرا چھپر کھٹ کیا ہوا؟ میرا دوشالہ کہاں گیا؟ میری پھولوں کی سیج کہاں چلی گئی؟ ابا ابا۔ اُٹھو جی۔ کب تک سوؤ گے تم بھی چلے گئے۔ اماں بھی چلی گئیں۔ دادا بھی قید ہو گئے۔ شاہی کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ نہ محل رہے۔ نہ شال دوشالے رہے نہ لونڈی غلام رہے۔ کون سُنے میرا یہ حال؟ کون دیکھے میرا یہ انقلاب؟ کس کو یقین آئے گا کہ شہنشاہ ہندوستان کی پوتی یوں گیلی خاک پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مری ہو گی۔ کون مانے گا کہ اِس دنیا کے عیش و آرام کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کس سے کہوں۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ کہ یہ دُنیا جی لگانے اور گھمنڈ اور غرور کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ آج جو بچے ماں باپ کی محبت اور لاڈ سے خوش ہیں۔ اور ذاتی لیاقت پیدا کرنے سے غافل ہیں وہ ذرا میرا حال دیکھیں کہ میں اپنی ماں کی نصیحت سے بگڑتی تھی۔ اور یہ وقت میرے خواب و خیال میں بھی نہ آتا تھا۔ آہ آہ

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے ۔۔۔ یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

یہ کہتے کہتے بے چاری گُل بانو مر گئی۔ اور صبح درگاہ والوں نے اُس کو اُس کے باپ کے پہلو میں دفن کر دیا۔ (یہ کہانی گراموفون ریکارڈ میں بھی بھری گئی ہے۔ حسن نظامی)

آسمان کی آوازیں

ریڈیو کے ذریعہ بیربل سے بات چیت

(جنوری ۱۹۳۶ء میں نشر ہوئی۔)

جب گراموفون اور سینما کے موجد مسٹر ایڈیسن کی روح آسمان پر گئی اور دنیا کی زندگی موت کے فرشتہ نے مسٹر ایڈیسن سے چھین لی۔ اور روح کو خدا کے سامنے پیش کیا گیا تو مسٹر ایڈیسن کی روح نے خدا سے کہا۔ اے خدا میں نے تیری مخلوق کو خوش کرنے کے لئے دنیا میں بہت سی ایجادیں کی تھیں۔ جن سے تیری مخلوق فرحت اور عیش کی زندگی بسر کر رہی ہے پس آج مجھے اس جرم میں کہ روپیہ جمع کرنے کے لئے ایجادیں کرتا تھا تنہائی کی قید میں نہ ڈال اور میری خدمت خلق کے سبب مجھ کو ارواح کی سوسائٹی سے ملنے کی اجازت مرحمت فرما۔

عرش اعظم کے عرض بیگی فرشتہ نے خدا کے حکم سے مسٹر ایڈیسن کی روح کو یہ جواب دیا" اے ایڈیسن تیری عرض داشت الٰہی سرکار نے سُنی۔ اور وہ تجھ پر رحم کرکے حکم دیتی ہے۔ کہ جا۔ اے گورے بندہ تجھ کو سب روحوں سے ملنے کی اجازت ہے۔

ایڈیسن نے خوش ہو کر کہا۔ تھینکیو مائی ڈیر گاڈ۔ میں تیرا بہت ہی شکر گزار ہوں۔ اے خدا اگر میری چیک بک یہاں ہوتی تو میں ایک چیک تیرے غریب بندوں کی مدد کے لئے ابھی اس شکرانہ میں لکھ دیتا"۔ پھر کہا" اے خدا مجھے اس کی بھی اجازت دے کہ تیری دی ہوئی قوت سائنس سے یہاں بھی کام لوں۔ اور یہاں کی رہنے والی ارواح کی دنیا کے رہنے والوں سے باتیں کراؤں۔

عرض بیگی فرشتہ نے جواب دیا۔ تجھ کو کامل آزادی نہیں مل سکتی۔ کیونکہ ابھی تو اس قابل نہیں ہے۔ صرف پندرہ منٹ کی اجازت دی جاتی ہے کہ تو راجہ بیربل سے حسن نظامی کی بات کرا دے۔ اس حکم کے بموجب مسٹر ایڈیسن نے راجہ بیربل کی روح کا

حسن نظامی کے گوشِ تصور سے ملان کردیا۔ اور حسن نظامی دہلوی نے سنا کہ راجہ بیربل کی روح کہہ رہی ہے۔

میں ہوں راجہ بیربل شہنشاہ اکبر کا مصاحب خاص۔ آسمان کے عالم ارواح سے بول رہا ہوں۔ کیا تم حسن نظامی ہو؟

حسن نظامی نے جواب دیا۔

ہاں راجہ جی میں حسن نظامی ہوں۔ تمہارا کیا حال ہے؟ اور تمہارے بادشاہ اکبر کیسے ہیں؟

راجہ بیربل نے جواب دیا۔

میں اچھا ہوں۔ مجھے سرحدی پہاڑوں کے وحشیوں نے قتل کردیا تھا۔ اُس وقت سے یہاں ہوں۔ شہنشاہ اکبر بھی یہاں ہیں اور اچھے ہیں۔ اور ابوالفضل اور فیضی بھی اُن کے پاس ہیں۔ نواب خان خاناں بھی۔ اور بدایوں سے ملا عبدالقادر مورخ بھی یہاں آگئے ہیں۔

حسن نظامی نے پوچھا۔

آسمان کے عالم ارواح میں تم لوگ کیا کرتے ہو۔

راجہ بیربل نے جواب دیا۔

ہمارے بادشاہ کو خدمتِ خلق کے سبب اچھی جگہ مل گئی ہے۔ اور ہم بھی اُنہی کے پاس رہتے ہیں۔ ملا عبدالقادر بادشاہ کو تاریخ سناتے ہیں۔ کئی روز سے مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب 'دربار اکبری' پڑھی جا رہی ہے۔ اور مہابلی جہاں پناہ اس کی لاجواب عبارت کی بہت قدر کرتے ہیں۔

حسن نظامی نے دریافت کیا۔

تم وہاں کیا کھاتے ہو؟ اور کیا پہنتے ہو۔ اور کہاں رہتے ہو؟

راجہ بیربل نے جواب دیا۔

نئی دہلی کے امپیریل ہوٹل سے کھانا آجاتا ہے۔ گاندھی بھنڈار دہلی سے کھدر کے کپڑے آجاتے ہیں۔ مگر ملا عبدالقادر نہ وہ کھانا کھاتے ہیں نہ کپڑے پہنتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ ہوٹل کا کھانا حرام ہے۔ اور کھدر کے کپڑے بھی نہیں پہنتے۔ اُن کو ستّر حوریں ملی ہیں۔ وہ اُن کے لئے جاپانی ریشم کے کپڑے سی دیتی ہیں۔

راجہ بیربل نے پوچھا۔

وقت کم ہے۔ فرشتہ پاس کھڑا ہے۔ پندرہ منٹ سے زیادہ بولنے کی اجازت نہیں ہے۔ اِس واسطے اِس سوال کا جلدی جواب دینا۔ کہ میری نسبت اور میرے بادشاہ کی بابت ہندوستان کی عام رائے کیا ہے؟

حسن نظامی نے جواب دیا۔

تمہارے لطیفے گھر گھر مشہور ہیں۔ اور تم کو ہندو مسلمان دونوں جانتے ہیں۔ اور تمہارے بادشاہ اکبر کی بھی ہر شخص تعریف کرتا ہے۔ تم ملا عبدالقادر صاحب سے کچھ ناراض معلوم ہوتے ہو۔ مگر انھوں نے تم سب کے کارنامے تاریخ لکھ کر زندہ کر دیئے ہیں۔ اور ابوالفضل کی آئین اکبری، اور مولانا آزاد کی دربار اکبری، نے اکبری حکومت کو آئینہ میں دکھا دیا ہے۔ اور ہم سب زندہ آدمی تم سب مرنے والوں کو بہت لائق اور بہت عقلمند سمجھتے ہیں اور تمہارے طرز حکومت سے سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر تم زمین پر زندہ ہوتے تو ہم تم کو اسمبلی کا ممبر بناتے۔ اور تمہارے الکشن کے لئے خوب کوشش کرتے۔

راجہ بیربل نے پوچھا۔

اسمبلی کیا چیز ہے؟ اور الکشن کیا ہوتا ہے؟ اور ممبری کس کو کہتے ہیں؟

حسن نظامی نے جواب دیا۔

ہندوستانی قوموں کی طرف سے کچھ آدمی منتخب ہو کر ایک مکان میں جمع ہوتے ہیں۔ اور حکومت کرنے کے طریقوں اور رعایا کی ضرورتوں پر مشورے کرتے ہیں۔ اور اُن کے لئے

قانون بناتے ہیں۔ اِس کو اسمبلی کہتے ہیں۔ اور طریقۂ انتخاب کا نام الکشن ہے۔ اور منتخب ہونے والے کو ممبر کہا جاتا ہے۔

اگر تم الکشن کے لئے کھڑے ہوتے تو ہم تمہارے واسطے ووٹ حاصل کرنے کے لئے رعایا سے کہتے "کہ یہ راجہ بیربل ہیں۔ شہنشاہِ اکبر کے مصاحب خاص۔ اِن کو ووٹ دو" تو بے تمیز نوجوان جواب دیتے "اِن میں لیاقت کتنی ہے؟ بادشاہ کا مصاحب ہونا کوئی چیز نہیں ہے؟ ہمارے فائدہ کے لئے یہ کیا کام کر سکتے ہیں؟ وہ بتاؤ۔ یہ بات سُنکر راجہ بیربل نے کہا۔

تو کیا ہندوستان کے نوجوان اتنے خودسر اور بے باک ہو گئے ہیں۔ کہ ملک کے بڑے آدمیوں کی نسبت ایسی گستاخانہ باتیں کرتے ہیں؟

حسن نظامی نے جواب دیا۔

یہ گستاخی نہیں رائے کی آزادی ہے۔ جب حکومت خلقت کے فائدہ کے لئے ہوتی ہے تو خلقت کو اپنے نفع نقصان پر غور کرنے اور اظہار خیال کرنے کی اجازت ملنی ضروری ہے۔

راجہ بیربل نے کہا۔

کچھ دنوں سے ہوائی جہاز ہمارے گھر کے پاس سے گزرا کرتے ہیں۔ مگر اُن کے اندر والے ہم کو دیکھ نہیں سکتے۔ ایڈیسن صاحب کہتے تھے۔ کہ میں بجلی کے زور سے اپنے مکانوں کے پردے ہٹا دوں گا۔ اور ہوائی جہاز والے ہم کو دیکھ سکیں گے۔ جیسے کہ ہم اُن کو دیکھ سکتے ہیں۔ جب یہ انتظام ہو جائے تو تم لالہ سری رام کے گھر سے کچھ پوریاں، کچھ اچار اور تھوڑا سا سونٹھ پانی بھیجدینا۔ کیونکہ بہت دن ہوئے کہ دیسی کھانا ہم نے نہیں کھایا۔ اور مُلّا عبدالقادر کے لئے پلاؤ، زردہ اور قورمہ شیرمال بھی بھیجدینا۔ کیونکہ وہ آج کل امپیریل ہوٹل دہلی کا کھانا نہ کھانے کے سبب جنت سے ایک پیالہ دودھ کا اور ایک پیالہ شہد کا منگا کر استعمال کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس غذا سے جی اُکتا گیا ہے۔

حسن نظامی نے کہا۔
بہشت میں بھی پلاؤ زردہ کا انتظام ہو سکتا ہے۔ حوریں پکا دیں گی۔ مگر اس کا جواب راجہ جی نے یہ دیا۔ کہ پندرہ منٹ ہو چکے ہیں۔ فرشتہ کہتا ہے کہ بات ختم کرو۔ اس لئے اب میں جاتا ہوں۔

نوٹ:۔ یہ کہانی دراصل الکشن کی خرابیوں کے خلاف تھی۔ جس کو ریڈیو کے محکمہ نے منظور نہیں کیا تھا۔ اور میں نے الکشن والا قصہ اس تقریر سے خارج کر دیا تھا۔ مگر میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر رسالہ ہمایوں لاہور نے اس تقریر کو مکمل اپنے رسالہ ہمایوں میں نہایت اہتمام سے چھاپا تھا۔ اہتمام سے مراد یہ ہے کہ میاں صاحب نے اس مضمون کو باتصویر بنا دیا تھا۔ اور میرے ہر خیال اور بیان کی تصویریں بھی بنوا کر مضمون کے ساتھ شائع کی تھیں۔ اور اس کا انگریزی ترجمہ کسی شخص نے سر فرینک نائس ممبر انڈسٹری اور سر ہنری کریک ہوم ممبر گورنمنٹ ہند کو بھیجا تھا۔ اور ان دونوں نے اس تقریر کو بہت پسند کیا تھا۔ یہاں تک کہ ان دونوں نے ایک پارٹی میں مجھ سے خواہش کی تھی۔ کہ میں اردو میں ان کو اپنی زبان سے وہ تقریر سناؤں۔ چنانچہ میں نے ان کو زبانی یہ تقریر سنائی تھی۔

اس کتاب کے آخر میں رسالہ ہمایوں سے وہ تقریر نقل کر کے درج کر دی جائے گی تاکہ ناظرین اس سے لطف حاصل کر سکیں۔ مگر رسالہ ہمایوں میں شائع ہونے کے بعد میں نے اس تقریر میں اور بھی بہت سے اضافے کئے ہیں اور یہ تقریر مجھے حفظ ہو گئی ہے جو میں نے ہندوستان کے بہت سے شہروں میں بڑے بڑے علمی حلقوں میں زبانی سنائی اور ہر شخص نے اس کو بہت پسند کیا۔ جس سے ظاہر ہوا کہ سارا ملک الکشن کی موجودہ خرابیوں اور کشمکش سے بیزار ہے۔

ناظرین کتاب ہذا ہمایوں والا مضمون کو ذرا توجہ سے پڑھیں اور اس کے بعد اس مضمون کو بھی دیکھیں جو ہمایوں میں شائع ہونے کے بعد چند اضافوں کے ساتھ میں نے تیار کیا تھا۔ حسن نظامی

ہمزاد اور روح

یہ تقریر یکم مئی ۱۹۳۶ء کی شام کو ساڑھے آٹھ بجے دہلی ریڈیو میں نشر کی گئی

۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء کی شام کو پانچ قصے جنات اور بھوتوں کے میں نے سنائے تھے۔ اُن کو سُن کر عجیب و غریب خط میرے پاس آئے۔ ایک صاحب نے لکھا میں تو جنات کا قائل نہ تھا۔ آپ کہتے ہیں تو مجبوراً مان لوں گا۔ ورنہ کُجا یہ روشن زمانہ۔ اور کُجا عقل کے خلاف یہ باتیں؟

لہذا آج کے قصے سُنانے سے پہلے مجھے شک اور انکار کرنے والوں سے یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنات اور بھوتوں کا انکار اس واسطے کرتے ہیں کہ آنکھوں دیکھی دلیل اُن کے پاس نہیں ہے۔ میں اُن کے جواب میں کہتا ہوں کہ اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہوتے اور کسی ایسے گاؤں میں پیدا ہوتے جہاں ٹیلی فون اور گراموفون اور ریڈیو کا حال کسی کو معلوم نہ ہوتا اور پھر تعلیم یافتہ شہری اس گاؤں میں ان تینوں کے قصے سناتا تو ان تینوں کا یقین کرنا اور شہری کو یقین دلانا کس قدر مشکل ہو جاتا۔ شہری کہتا۔ گراموفون کے ریکارڈ میں آواز بند ہو کر ہمیشہ آتی رہتی ہے۔ ٹیلی فون سے ہزاروں کوس دور کے آدمی بات کر سکتے ہیں۔ ریڈیو کے ذریعہ سب کی آواز لاکھوں کوس جا سکتی ہے۔" تو وہ ٹیلی فون ریڈیو اور گراموفون کو مان لیتے یا نہیں۔

پس میں اگر فرشتوں کو اور جنات کو اور ارواح کو آسمانی کتابوں اور پیغمبروں کے بیان کی بموجب اور ذاتی مشاہدات کی بنیاد پر مانتا ہوں تو میں ایک تعلیم یافتہ شہری ہوں۔ اور انکار کرنے والے گاؤں کے چودھری صاحب کی طرح ہیں۔ کہ چوپال میں بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ اور اپنی عقل اور علم سے باہر دنیا کی ہر چیز کا انکار کئے جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر ٹیلی فون یا گراموفون یا ریڈیو میں آوازیں آتی ہیں تو کوئی جن یا بھوت بولتا ہوگا

یا چڑیل باتیں کرتی ہوگی۔

بے عقل میں بھی نہیں ہوں۔ توہمات اور خام خیالی کا قبضہ مجھ پر بھی نہیں ہے آنکھوں سے جنات کو اُن کی اصلی شکل میں میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُن کے ماننے یا اُن سے ڈرنے کے نقصان کو میں بھی جانتا ہوں۔ پھر بھی مجھے یقین ہے۔ کہ جن بھی ہیں۔ اور بھوت بھی ہیں ارواح بھی ہیں۔ مؤکل بھی ہیں۔ اور ہمزاد بھی واقعی ایک چیز ہے۔ اور ہمزاد تو میں نے تابع بھی کیا تھا۔ اور ہمزاد کو اپنی شکل میں دیکھا تھا جس کا قصہ سُناتا ہوں۔

میرے ہمزاد کا قصہ } لانا ذرا عقل کا کانٹا لانا۔ تولہ ماشہ رتی بھی لیتے آنا تاکہ میرے اس قصہ کو تول تول کر وزن کر لیا جائے۔ کہ عقل کی بموجب یہ کیا چیز تھی جو میں نے دیکھی۔ سُنیے۔ قصہ یوں ہے۔ کہ میری عمر ۲۵ سال کی ہوگی۔ سنور ریاست پٹیالہ کے ایک بزرگ عامل نے مجھے ہمزاد کا عمل سکھایا اور کہا یہ عمل الٹی بسم اللہ کا ہے۔ عمل یہ ہے مِیحَرْ لَانْ مِحَرْ لَاہ لَاْ مِسَب اِس کو انیس ہزار انیس بار کھڑے ہوکر روزانہ رات کے وقت پڑھا جاتا تھا چراغ پیٹھ کے پیچھے رکھا جاتا تھا۔ اور میں اپنے سایہ کو دیکھ کر عمل پڑھتا تھا۔ عمل شروع کرنے سے پہلے چھری سے ایک کُنڈل اپنے چاروں طرف بنا لیتا تھا۔ اور چھری کُنڈل کے اندر رکھ لیتا تھا۔ استاد کا کہنا تھا کہ کُنڈل کے باہر جو تماشا دیکھو اُس سے نہ ڈرنا۔ کُنڈل کے اندر کوئی چیز آجائے تو چھری مارنا۔ یہ عمل ۶ گھنٹے میں پورا ہوتا تھا۔ اور میں کھڑے کھڑے اس قدر تھک جاتا تھا۔ کہ چکر آنے لگتے تھے۔ آٹھویں دن مجھے اپنا سایہ ہلتا دکھائی دیا۔ نویں دن وہ سایہ قلابازیاں کھانے لگا۔ دسویں دن غائب ہو گیا۔ یعنی میرا سایہ مجھے دکھائی نہ دیا۔ اور انیسویں دن تک غائب رہا۔ میں روز عمل پڑھتا تھا۔ روشنی پشت پر ہوتی تھی۔ مگر مجھے اپنے قد کا سایہ حجرہ کے اندر دکھائی نہ دیتا تھا۔

اس حجرہ میں میری پشت پر ایک روشن دان تھا۔ جس کے کواڑ بند کر کے میں کنڈی لگا لیا کرتا تھا۔ انیسویں رات میں کھڑا میحر لان میحر لاہ لامسب پڑھ رہا تھا۔ کوئی دو بجے

رات کا عمل ہوگا یکایک مجھے روشن دان سے کسی جانور کے اڑنے کی اور اندر آنے کی آواز آئی۔ سامنے روشنی میں دیکھا کہ ہو بہو میری شکل صورت اور میرے لباس کا سا ایک آدمی میرے سامنے دروازہ کی طرف پیٹھ کئے بیٹھ گیا۔ مگر کنڈل سے باہر ہے۔ وہ آدمی مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو مجھے اپنی صورت کا آدمی دیکھ کر حیرت ہوئی اور کچھ دیر کے بعد میں ڈرا۔ اور مجھ پر خوف طاری ہوا۔ عمل پڑھتا تھا تو ٹپ ہانہ جاتا تھا۔ زبان سوکھ گئی تھی۔ حلق خشک ہو گیا تھا۔ اور عمل کے فقرے زبان سے ادا کرنے دشوار معلوم ہوتے تھے۔ آخر میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ تب بھی وہ شکل آنکھوں سے دور نہ ہوئی۔ اور بند آنکھوں کو بھی نظر آتی رہی تو میں نے آنکھ کھول دی یکایک پھر کسی جانور کے اڑنے کی اور روشن دان کے اندر آنے کی آواز آئی اور ایک دوسرا آدمی میری شکل کا پہلے آدمی کی برابر آکر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں چپ تھے اور مجھے گھور گھور کر غصہ کی آنکھوں سے دیکھتے جاتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر کسی جانور کے اڑنے کی اور اندر آنے کی آواز آئی۔ اور تیسرا آدمی میری صورت کا اور آگیا۔ اور یہ بھی مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ میرا عجب حال تھا۔ تمام جسم کانپ رہا تھا۔ عمل کے فقرے زبان سے ادا ہونے بند ہوگئے تھے۔ تسبیح ہاتھ سے گر پڑی تھی۔ جس سے عمل کا شمار کیا کرتا تھا۔ یکایک میں نے سنا کہ پہلے آنے والے نے میری سی آواز میں بعد کے دونوں آنے والوں سے کہا۔ میاں کچھ پکاتے نہیں ہو؟ دوسرے نے کہا کیا پکائیں؟ تیسرے نے کہا۔ کڑھائی کرو۔ یہ کہتے ہی پہلا آدمی اُچکا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ اڑ کر میرے سر کے اوپر سے روشن دان میں گھس گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ آدمی پھر اندر آیا۔ اور اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک چولہا تھا اور لکڑیاں تھیں۔ یہ آگیا تو دوسرا آدمی اڑ گیا۔ اور کچھ دیر کے بعد آیا تو ایک کڑھائی اور تیل کا ایک کنستر لایا۔ کنستر پر چیکٹ لگا ہوا تھا۔ انھوں نے کڑھائی چولھے پر رکھ دی۔ اور تیل کڑھائی میں بھر دیا۔ اور لکڑیاں چولھے میں بھر دیں۔ تیسرے آدمی نے لکڑیوں میں ایک پھونک ماری۔ لکڑیاں خود بخود جلنے لگیں۔ اور تیل میں جوش آنے لگا۔ اس کے بعد وہ تینوں

آپس میں کہنے لگے۔ اب اس کڑھائی کے تیل میں کیا تلیں۔ پہلے آنے والے نے کہا۔ اِس آدمی کو تیل میں ڈال دو۔ جو سامنے کھڑا ہے۔ یہ سُنکر میری بُری حالت ہو گئی۔ اور غش آتا معلوم ہوا۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اور سارا بدن تھر تھرا رہا تھا۔ اور پسینہ آرہا تھا۔ آخر میں جھکا اور میں نے کانپتے ہاتھ سے چھری زمین سے اٹھالی اور چھری کو دونوں ہاتھوں میں اس خیال سے پکڑ لیا کہ اگر یہ لوگ میری طرف مجھے پکڑنے کو بڑھیں تو میں اُستاد کی ہدایت کی موافق ان کے چھری ماروں۔ ایکا ایکی کیا دیکھتا ہوں کہ چولھے کی بھڑکتی ہوئی آگ کے اندر ایک زندہ چوہا پھر رہا ہے۔ میرے خوف میں ذرا کمی ہوئی اور میں چوہے کو دیکھنے لگا کہ یہ جلتا نہیں۔ آگ میں پھر رہا ہے۔ ان تینوں آدمیوں میں سے کسی آدمی نے جس کا مجھے خیال نہیں رہا کہ پہلا تھا یا دوسرا تھا، چولھے کے اندر ہاتھ ڈالا اور چوہے کی دُم پکڑی اور چوہے کو آگ سے باہر لے آیا اور چوہے کو کڑھائی کے جوش کھاتے ہوئے تیل میں ڈالدیا۔ میں نے دیکھا چوہا اُبلتے ہوئے تیل میں کبھی اوپر آتا ہے اور کبھی تیل کے اندر چھپ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چوہے نے اپنا منہ تیل کے باہر نکالا۔ اور اُس کی ناک کے اندر سے خون کا فوارہ نکلنے لگا۔ اور اتنا نکلا کہ کڑھائی میں تیل نہ رہا۔ خون ہی خون دکھائی دینے لگا۔ اور خون بھی تیل کی طرح کھول رہا تھا۔ اِس خون کے اندر سے کالے آدمی کا ایک سر نکلا جس کے بال جلیبیوں کے سے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور کٹی ہوئی اور لال لال۔ چہرہ کالا۔ ناک چپٹی۔ دانت زرد اور بے حد خوفناک۔ اِس چہرہ نے بھی مجھے گھورنا شروع کیا۔ اور اُس کے اندر سے بلّی کے غرّانے کی سی آواز آنی شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ وہ آواز بڑھی اور شیر کی سی گرج اِس آواز میں پیدا ہوئی۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ کالا حبشی چہرہ اُبلتے اور جوش مارتے خون کی کڑھائی سے میری طرف غُراتا ہوا بڑھا۔ وہ اپنے زرد زرد لمبے دانت نکالے ہوئے خوفناک آنکھوں سے مجھے دیکھتا ہوا میری طرف بڑھتا نظر آیا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ چہرہ کڑھائی سے نکل کر اُس کُنڈل (حصار) کے اندر آگیا ہے جس کے اندر میں کھڑا تھا۔ میرا ڈر

کے مارے بُرا حال تھا۔ اور قریب تھا کہ میں چیخ مار کر گر پڑوں کہ مجھے اُستاد کی بات یاد آئی۔ کہ کوئی چیز کنڈل کے اندر آجائے تو اُس کے چھری مارنا۔ میں نے چھری کا دستہ دونوں لرزتے ہاتھوں سے پکڑا اور بہت زور سے وہ چھری اُس حبشی کے تالو پر ماری۔ چھری کا مارنا تھا کہ ایسا معلوم ہوا۔ گویا میں نے وہ چھری اپنے دل میں ماری۔ اور میں غش کھا کر گر پڑا۔

میں ساری رات بے ہوش پڑا رہا۔ صبح ہوئی سورج نکلا تو ہوش آیا۔ میں نے دیکھا۔ وہاں نہ کڑھائی ہے نہ چولھا ہے نہ لکڑیاں ہیں۔ نہ آگ کا نشان ہے نہ ان تینوں آدمیوں کا پتہ ہے۔ نہ اُن کے بیٹھنے کی جگہ کوئی علامت ہے۔ اور چھری کنڈل کے باہر زمین میں گڑی ہوئی ہے۔ باوجود خوف اور ڈر کے میں نے چھری اِس زور سے ماری تھی کہ وہ زمین کے اندر آدھی گھس گئی تھی۔ میرا یہ حال تھا گویا برسوں سے بیمار ہوں۔ بہت مشکل سے اُٹھا اور حجرہ کے کواڑ کھولے۔ ہاتھ پاؤں میں دم نہ تھا۔ اور سر چکرا رہا تھا۔ اِس واقعہ کے بعد بھی چھ مہینے بیمار رہا۔ اور میرے ہمزاد کا عمل خراب ہوگیا۔ اُستاد کہتے تھے۔ اگر تم صبر کرتے اور حبشی کے سر میں چھری نہ مارتے تو عمل پورا ہو جاتا اور ہمزاد تمہارے کام کرنے لگتا۔ اور تمہاری صورت کا ایک آدمی ہمیشہ تمہاری پشت کی طرف کان کے پاس آکر کھڑا ہو جایا کرتا۔ اور تمہارے کان میں باتیں کیا کرتا۔ اور یہ فوراً آجایا کرتا۔ جب تم اپنے دل میں خیال کرتے کہ ہمزاد آجائے۔ اور ہزاروں کام ایسے کیا کرتا جو کسی آدمی سے نہ ہو سکتے۔

میں نے اُستاد سے پوچھا کہ ہمزاد کیا باتیں کرتا ہے۔ اُستاد نے کہا وہ خبریں سُناتا ہے۔ کہ فلاں جگہ ایسا ہوا۔ فلاں آدمی جو تمہارے سامنے آیا ہے فلاں جگہ کا رہنے والا ہے اس کا نام یہ ہے اور اُس کا تم سے یہ کام ہے۔ استاد نے یہ بھی کہا کہ ہمزاد سے جو کچھ منگاتا ہو قیمت دیدو فوراً بازار سے وہ چیز سامنے آجائے گی۔ ہمزاد یہ بھی بتا دیتا ہے کہ فلاں شخص نے فلاں کے ہاں چوری کی ہے اور چوری کا مال فلاں جگہ رکھا ہے۔ بس یہ تھا میرے ہمزاد کا قصہ جو مجھے پیش آیا تھا۔ اب عقلمند سُننے والے بتائیں کہ میرے اس ذاتی مشاہدہ کی نسبت اُن کی کیا رائے

ہے؟ میں نے اُس وقت یہ رائے قائم کی تھی - کہ انیس دن کی محنت اور چھ گھنٹے کھڑے رہنے اور اپنے سایہ کو برابر دیکھتے سے میرے اپنے تخیل نے یہ سب تصویریں بنائی تھیں - ورنہ حقیقت میں یہ کچھ بھی نہ تھا - اور جو کچھ ہے وہ سب آدمی کے اندر ہے - باہر کچھ بھی نہیں ہے - شیطان بھی ہمارے اندر ہے فرشتے بھی ہمارے اندر ہیں - اور جنات بھی اور بھوت بھی - اور نئی سائنس والے اگر اِن غیبی چیزوں کی تحقیقات کرنی چاہیں تو اُن کو بہت عجیب عجیب باتیں معلوم ہو جائیں اور پھر نئی عقل والے لوگ کم از کم اِن باتوں کا انکار نہ کریں -

ایک روح کی کہانی } ۱۹۱۰ء کا ذکر ہے ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی درگاہ کے قریب کوئی کنواں نہیں ہے - باؤلی کا پانی کھاری ہے - اگر آپ کہیں تو میں درگاہ کے شرقی دروازہ پر کنواں بنوا دوں - میں نے جواب دیا - ہاں صاحب یہاں میٹھے پانی کی بہت تکلیف ہے - شاید کنوئیں کا پانی میٹھا نکل آئے - ان صاحب نے کہا - مگر یہاں قبریں بہت زیادہ ہیں - کنواں کھودا جائے گا تو قبروں کو توڑنا پڑے گا - میں نے کہا قبروں کی ہڈیاں دوسری جگہ احتیاط سے دفن کر دینا - کیونکہ پانی کی ضرورت بہت زیادہ ہے - یہ کہہ کر میں تو الہ آباد چلا گیا - اور اُن صاحب نے کنواں کھدوانا شروع کیا - قبروں سے ہڈیاں نکلتی تھیں تو وہ دوسری جگہ ادب واحترام سے دفن کرا دیتے تھے - یہاں تک کہ جب پانی کے قریب پہنچے تو وہاں کسی آدمی کا پورا ڈھانچ نظر آیا - سب کو حیرت ہوئی کہ اوپر کی قبروں کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں کسی کی کھوپڑی تھی کسی کی پاؤں کی ہڈیاں تھیں - مگر اتنی گہری جگہ میں یہ پورے آدمی کا ڈھانچ کیونکر باقی رہا - اور اتنی گہری قبر کس نے بنائی ؟

بہر حال اِس ڈھانچ کو دیکھ کر مزدور ڈر گئے اور انھوں نے اِن ہڈیوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کیا - تو کنواں کھدوانے والے صاحب خود لاؤ کے رستے میں ٹوکرہ باندھ کر کنوئیں کے اندر اُترے - اور انھوں نے کدال ہاتھ میں لے کر ڈھانچ کے گھٹنہ پر ماری تاکہ ہڈیاں توڑ کر اوپر لے جائیں - اور کسی جگہ دفن کر دیں - کدال کے مارتے ہی اُن کا گورا رنگ کالا ہو گیا - اور

یہ دیوانوں کی سی باتیں کرنے لگے جو مزدور ان کے ساتھ کنوئیں میں گیا تھا اس نے ان کو ٹوکرہ میں باندھ دیا اور بہت مشکل سے ان کو کنوئیں کے باہر لایا۔ کنوئیں کے پاس بہت سی خلقت جمع ہو گئی سب حیران تھے کہ ابھی تو ان کا رنگ گورا تھا اب یہ ایسے کالے کیونکر ہو گئے؟ یہ شخص بار بار کہتے تھے میرے بھانجہ کا پاؤں توڑ ڈالا۔ میرے بھانجہ کا پاؤں توڑ ڈالا۔ آخر ان کو ان کے گھر میں لے گئے اور بڑے بڑے عامل بلائے گئے مگر ان کو کوئی اچھا نہ کر سکا آخر تیسرے دن اس کنوئیں کو بند کر دیا گیا سب مٹی اور ہڈیاں اس کنوئیں کے اندر بھر دی گئیں۔ اور کنواں زمین کے برابر ہو گیا۔ تب ان صاحب کا رنگ بھی گورا ہو گیا اور دماغ کی خرابی بھی درست ہو گئی۔ اور وہ اب تک درگاہ میں موجود ہیں۔

میں الہ آباد کے سفر سے واپس آیا تو میری مرحومہ بیوی نے سارا قصہ مجھے سنایا۔ میں اپنے پیدائشی گھر میں پلنگ پر چت لیٹا ہوا تھا۔ لیمپ سرہانے رکھا تھا۔ اور میں لیٹا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ پلنگ کے نیچے دری پر میری مرحومہ بیوی اور ان کی والدہ بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں اور مجھے قصہ سنا رہی تھیں۔ میں پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور میں نے اپنی مرحومہ بیوی سے کہا کہ تم سمجھیں کہ وہ کیوں کالے ہو گئے۔ اور دیوانے کیوں ہو گئے۔ بیوی نے کہا کسی بزرگ کا مزار تھا انہوں نے بے ادبی کی مزار والوں کی روح نے ان کو قبر توڑنے کی سزا دی اور وہ کالے ہو گئے۔ اور دیوانے ہو گئے۔ مگر جب اُن کے وارثوں نے قبر بند کرا دی اور کنواں بھی بند کرا دیا تو روح نے تین دن بعد ان کی خطا معاف کر دی اور وہ اچھے ہو گئے۔

میں نے بیوی سے کہا۔ نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ یہ بات ہے کہ مردہ کی ہڈیاں صدیوں سے مٹی کے اندر دبی ہوئی تھیں اور ہڈیوں کے اندر فاسفورس ہوتا ہے فاسفورس زہریلا ہو گیا تھا جب انہوں نے ڈہاپچ کے کدال ماری ہڈی ٹوٹ گئی اور اس کے اندر سے وہ فاسفورس اڑا اور اُن کی ناک میں سانس کے ساتھ گھس گیا اور بدن کے خون میں جذب ہو گیا۔ اور اپنے زہر سے خون کو کالا کر دیا۔ خون کالا ہوا تو ان کا چہرہ بھی کالا ہو گیا۔ اور وہ

دیوانے بھی اس وجہ سے ہوئے کہ ان کے دماغ پر زہریلے فاسفورس نے بڑا اثر کیا ہوگا۔ اگر روح کچھ کرسکتی تو مجھے سزا دیتی کیونکہ میں نے ان کو کنواں کھودنے اور قبریں توڑنے کا فتویٰ دیا تھا اور اگر روح میں کچھ طاقت ہے تو آئے مجھے اپنی طاقت دکھائے۔ اور مجھے سزا دے تم عورتیں کم زور عقیدہ کی ہوتی ہو میں روحوں کے ایسے اثر کو نہیں مانتا۔

بیوی نے جواب دیا تو بہ کرو کیسی باتیں کرتے ہو کیا تم وہابی اور نیچری ہوگئے ہو۔ میں نے کہا کم از کم میری عقل تمہاری طرح بودی نہیں ہے۔ بیوی نے کہا جانے دو۔ یہ باتیں چھوڑ دو۔ اپنا اخبار پڑھو۔ میں ایسی منکرانہ باتیں سُننا نہیں چاہتی۔ میں ہنسا اور اخبار پڑھنے لگا ان باتوں کو پانچ منٹ بھی نہیں ہوتے تھے اور میں چت لیٹا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا کہ کسی نے میرے پاؤں کے تلوؤں میں بجلی کی بیٹری لگائی۔ اور وہ بجلی سن سن کرتی میرے تمام بدن میں پھیل گئی۔ جس سے مجھے ایسی تکلیف ہوئی جس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے میری رگ رگ میں چھریاں چلتی معلوم ہوتی تھیں۔ میں بے تاب ہو کر چیخنے لگا میں نے اپنی چیخوں کی آواز خود سُنی مگر میری بیوی اور میری ساس آپس میں باتیں کرتی رہیں اور چھالیہ کترتی رہیں انھوں نے میرے چیخنے پر توجہ نہ کی۔ تو میں نے بیوی کا نام لے کر چیخنا شروع کیا کہ حبیب بانو ارے بی مجھے دیکھو میرا کیا حال ہوگیا۔ مجھے قبر والی روح نے دبا لیا۔ میں توبہ کرتا ہوں پھر کبھی کسی بزرگ کی روح کی بے ادبی نہیں کروں گا۔ مگر میری بیوی نے میری طرف توجہ نہیں کی اور اپنی ماں سے باتیں کرتی رہیں۔ میں ان کی اُن باتوں کو سُن رہا تھا جو وہ کر رہی تھیں اور میں نے اچھا ہونے کے بعد بیوی اور ساس سے کہا کہ تم دونوں نے یہ یہ باتیں کیں تو ان دونوں نے کہا ہاں ٹھیک ہے ہم نے یہ باتیں کیں تھیں۔ مگر تم تو سو گئے تھے۔ تم نے کوئی آواز ہم کو نہیں دی۔

میں نے اسی حال میں خیال کیا کہ شاید میرا دل دب گیا ہے اور اس کی وجہ سے یہ تکلیف ہے اس لئے آہستہ سے دائیں رُخ کروٹ لی۔ مگر پھر بھی تکلیف میں کمی نہ ہوئی۔ تب میں نے

توبہ کرنی شروع کی اور عہد کیا کہ کبھی روحوں کی بے ادبی نہ کروں گا۔ اور خدا کی پیدا کی ہوئی غیبی قوتوں اور قدرتوں کا انکار نہ کروں گا۔ یہ کہتے ہی وہ تکلیف جو سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی تھی پیروں کی طرف جاتی معلوم ہوئی۔ یہاں تک تھوڑی دیر میں بالکل جاتی رہی اور میں نے پھر اپنی بیوی کو پکارا تو انہوں نے فوراً جواب دیا۔ میں نے ان سے کہا ابھی پانچ منٹ تک میں ایسی سخت تکلیف میں مبتلا رہا اور تم کو آوازیں دیں مگر تم نہ بولیں بیوی نے کہا۔ تم تو سو گئے تھے اور اخبار تمہارے ہاتھ سے گر پڑا تھا۔ میں نے کہا کیا تم دونوں فلاں فلاں باتیں نہ کر رہی تھیں؟ انھوں نے کہا ہاں یہ باتیں میں نے کی تھیں۔ میں نے کہا اگر میں سو گیا تھا۔ تو میں نے تمہاری یہ باتیں کیونکر سُنیں؟ اس سوال کا جواب میری بیوی نہ دے سکیں۔ اور آج بتیس برس کے بعد میں ریڈیو کے سُننے والوں سے خاص کر اُن سے جو ان غیبی چیزوں کا اعتقاد نہیں رکھتے۔ پوچھتا ہوں کہ یہ کیا بات تھی جو مجھے پیش آئی اور ان کی عقلیں اس واقعہ کی نسبت کیا فیصلہ کرتی ہیں۔ اور اسی سوال پر میں آج کی بات چیت ختم کرتا ہوں آئندہ میں اپنے بھی قصّے سناؤں گا اور دوسروں کو جو قصّے جنات اور بھوتوں وغیرہ کے پیش آئے وہ بھی سُناؤں گا۔ اُمید ہے۔ کہ سائنس جاننے والے اصحاب ان غیبی چیزوں کی عقلی تحقیقات ضرور کریں گے۔ اور اس تحقیقات کے وقت مصر کی قدیمی قبریں کھودنے والوں پر جو مصیبتیں پڑیں ان کو بھی ذہن میں رکھیں گے تاکہ صحیح فیصلہ کر سکیں۔

دیو جن پری اور

بھوتوں کے قصّے

یہ تقریر ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو دلی ریڈیو میں نشر ہوئی

آج کی باتیں آدمیوں کو سنا رہا ہوں۔ جو جنات اور پریوں اور بھوتوں کو مانتے بھی ہیں اور بہت سے نہیں بھی مانتے۔ اور جب سے انگریزی تعلیم جاری ہوئی ہے بھوتوں اور پریوں کی ماننا بہت کم ہو گئی ہے مگر میں خود جنات کو مانتا ہوں۔ کیونکہ خدا کے کلام قرآن مجید اور انجیل اور توریت وغیرہ نے بھی جنات کا ہونا مانا ہے۔ اور سب پیغمبروں نے بھی ان کا وجود تسلیم کیا ہے۔ اور باوجود نئی روشنی کا معتقد ہونے کے میرا عقیدہ ہے کہ یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ اور ان سے انکار کرنا خدا کی عجیب مخلوق سے انکار کرنا ہے۔ پس اگر آج کی باتوں کو سننے والوں میں کوئی جن یا پری یا دیو یا بھوت یا چڑیل یا ماموں اللہ بخش یا شیخ سدو یا میراں یا نرسو بھی شریک ہوں تو میں قصے سنانے سے پہلے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ میری باتوں سے خفا نہ ہوں اور چھپ کر رہنا چھوڑ دیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں داخل ہوں اپنے بچوں کو پڑھائیں تاکہ جنگلوں اور ویرانوں میں رہنے کی عادت دور ہو اور سب کے ساتھ مل کر رہنے کا مزہ آئے۔ اور زندگی کی بہار حاصل کر سکیں۔ اور انکار کرنے والے بھی ان کا ہونا مان لیں۔

اب میں جنات اور بھوتوں کے قصے شروع کرتا ہوں۔ سننے والے اگر ان قصوں کو پسند کریں تو دہلی براڈ کاسٹنگ کو اطلاع دیدیں۔ تاکہ ان کے بعد کے قصے بھی سنائے جائیں ورنہ بس یہی کہانیاں سنا کر داستان کو ختم کر دیا جائے گا۔

پہلا قصہ میں پہلے اپنا قصہ سناتا ہوں۔ کہ جوانی کے شروع میں مجھے جنات اور بھوتوں اور ہمزادوں اور ستاروں کو تابع کرنے کا شوق تھا۔ اور میں دو برس تک اس شوق میں مبتلا رہا۔ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ کسی نے مجھ سے کہا۔ کہ پہلی بھیت میں ایک بزرگ رہتے ہیں جن کا

نام میاں محمد شبیر صاحبؒ ہے۔ اور وہ ایسا عمل جانتے ہیں جس سے جنات اور پریاں اور بھوت اور ہمزاد وغیرہ آدمی کے تابع ہو جاتے ہیں۔ یہ سُن کر میں پلی بھیت گیا۔ اور حضرت میاں محمد شبیر صاحب سے ملا۔ مگر اُن کی بزرگانہ اور فقیرانہ ہیبت کے سبب میری اتنی جرأت نہ ہوئی جو اپنا مقصد اُن سے کہتا۔ چُپ چاپ اُن کی محفل میں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ یکایک وہ خود میری طرف مخاطب ہوئے اور یہ کہنا شروع کیا۔

ارے میاں دِلّی والے سُنو! جب ہم تمہاری عمر میں تھے تو ہمیں جنّات تابع کرنے کا شوق ہوا۔ اور ہم کو ایک آدمی نے جنات مسخر کرنے کا عمل بتایا۔ اور ہم نے مسجد میں بیٹھ کر جنات کو تابع دار بنانے کا عمل شروع کیا۔ ہم مسجد کی لمبی جانماز پر بیٹھ گئے۔ جس پر بہت سے نمازی صف بندی کر کے نماز پڑھا کرتے ہیں۔ جوں ہی ہم نے عمل پڑھنا شروع کیا وہ جانماز خود بخود بغیر کسی لپیٹنے والے کے لپٹنی شروع ہوئی اور ہم بھی اس جانماز کے اندر لپٹ گئے۔ اور کسی نے ہم کو جانماز کے ساتھ لپیٹ کر مسجد کے کونہ میں کھڑا کر دیا۔ کچھ دیر تو ہم جانماز میں لپٹے ہوئے کھڑے رہے۔ آخر ہم نے بہت مشکل سے اس جانماز کو کھولا۔ اور اُس کے اندر سے نکلے۔ اور جانماز کو پھر اُس کی جگہ بچھایا۔ اور جانماز پر بیٹھ کر جنات کا عمل پڑھنا شروع کیا۔ مگر ہمارا دل ڈر رہا تھا۔ اور حیرت بھی تھی کہ کس نے ہمیں جانماز میں لپیٹ دیا۔ دوسری دفعہ بھی یہی ہوا۔ یعنی پھر کسی نے جانماز میں ہم کو لپیٹ کر کھڑا کر دیا۔ اور ہمارا دل دھڑکنے لگا۔ اور ہم بہت ڈرے۔ آخر ڈرتے ڈرتے جانماز کو کھولا۔ اور باہر نکلے اور جانماز کو بچھایا۔ اور عمل شروع کیا۔ تیسری دفعہ بھی ہم کو کسی نے لپیٹ دیا۔ اور ہم نے پھر کوشش کر کے اپنے آپ کو اِس قید سے نکالا۔ اور باہر نکلے تو ایک آدمی ہمارے سامنے آیا۔ اور اُس نے غصہ اور خفگی کے لہجہ میں کہا" تو یہ عمل کیوں پڑھتا ہے؟ اور ہم کو کیوں پریشان کرتا ہے؟

ہم نے کہا۔ کہ جنات کو تابع دار بنانے کے لئے۔ اُس آدمی نے جواب دیا" دیکھ میں جن ہوں۔ آدمی کی صورت میں آیا ہوں۔ تو ہم کو مسخر کرنے کی محنت نہ کر۔ ہم آسانی سے کسی کے

قابو میں نہیں آئیں گے۔ اس نے **تو خدا کا مسخر ہو جا** پھر ہم سب تیرے مسخر ہو جائیں گے۔ یہ قصہ سُنا کر حضرت میاں محمد شیر صاحب نے فرمایا۔ میاں اُس دن سے ہم نے تو جنات تابع کرنے کا شوق چھوڑ دیا۔ اور خدا کی تابعداری کرنے لگے۔ اور ہم نے دیکھا کہ **جو آدمی خدا کا تابعدار ہو جاتا ہے تو دنیا کی ہر چیز اُس کی تابعدار بن جاتی ہے۔**

دوسرا قصہ } اماں میرے دادا کا قصّہ بیان کرتی تھیں۔ کہ وہ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ میں سوتے تھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ یکایک انھوں نے دیکھا کہ ایک کتّا حضرت کے مزار کے سامنے کھڑا ہے۔ دادا نے اُس کتّے کے لکڑی ماری جس سے کتّے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اور وہ لنگڑاتا ہوا بھاگا۔ دادا دروازہ پر گئے تاکہ کواڑ بند کر دیں کیونکہ انھیں خیال تھا کہ دروازہ کھلا رہ گیا ہے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ بہت سے آدمی کھڑے ہیں۔ اور ایک آدمی پالکی میں لیٹا ہے اور کئی آدمی اُس کی ٹانگ پر پٹی باندھ رہے ہیں۔ دادا نے پوچھا "آپ کون صاحب ہیں؟ اور یہ ٹانگ میں کیا تکلیف ہے؟ زخمی آدمی نے جواب دیا" آپ ہی نے تو میری ٹانگ توڑی ہے۔ اگر آپ پیرزادے اور سید نہ ہوتے تو میں آپ کو نقش زمیں بنا دیتا۔ یعنی مار ڈالتا۔ میں جنات کا بادشاہ ہوں اور عاجزی کے خیال سے کتّے کی شکل میں مزار کی زیارت کرنے آیا تھا۔ دادا نے کہا۔ آپ نے بُرا کیا جو کتّے کی صورت میں آئے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ آپ جن ہیں۔ جنات کے بادشاہ نے کہا۔ ہاں غلطی میری ہے۔ آپ بے قصور ہیں۔

تیسرا قصہ } اماں کہتی تھیں۔ کہ اُن کے والد یعنی میرے نانا بہادر شاہ بادشاہ کے بھائی مرزا جہانگیر سے ملنے الہ آباد گئے۔ جہاں اُن کو انگریز کمپنی نے نظر بند کر رکھا تھا۔ مرزا جہانگیر نے نانا کو ایک بڑے مکان میں ٹھہرایا۔ نانا حقہ پیتے تھے۔ اس واسطے نوکر نے اُپلے کی آگ اور حقہ اور تمباکو پاس رکھدیا۔ اور فانوس میں شمع روشن کر دی اور گندھک لگی دیا سلائیاں بھی قریب رکھدیں۔ اس زمانہ میں گندک لگی دیا سلائیوں کو آگ سے روشن کرتے تھے۔ اور پھر دیا سلائی سے چراغ جلاتے تھے۔ نانا عشاء کی نماز پڑھ کر پلنگ پر لیٹ گئے سامنے شمع روشن

تھی۔ وہ لیٹے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ ایکا ایکی اُن کا پلنگ ہلا۔ اور کسی نے پلنگ کو اُدھیر اٹھا لیا۔ اور پلنگ زمین سے دو گز اونچا ہو گیا۔ نانا گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ اور انھوں نے پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ کہ کس نے میرا پلنگ اٹھایا۔ مگر کوئی چیز دکھائی نہ دی۔ جس دالان میں اُن کا پلنگ تھا اُس میں تین در تھے اور پلنگ بیچ کے در میں بچھا ہوا تھا۔ کسی نے اُس پلنگ کو اونچا کر کے بیچ کے در سے اٹھایا اور آخری تیسرے در میں لے جا کر بچھا دیا۔ جب پلنگ زمین پر بچھ گیا تو نانا پلنگ سے اُترے اور انھوں نے پلنگ کو گھسیٹا اور پھر بیچ کے در میں بچھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر پلنگ اٹھا اور وہ خود بخود تیسرے در میں چلا گیا۔ نانا پلنگ کو گھسیٹ کر پھر بیچ کے در میں لے آئے۔ یہاں تک کہ تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا۔ اور تیسری دفعہ بھی نانا پلنگ گھسیٹ کر بیچ کے در میں لے آئے۔ اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ تب ایک سایہ سا نمودار ہوا جو فانوس کے پاس گیا اور شمع خود بخود گل ہو گئی۔ نانا اٹھے اور انھوں نے گندھک لگی دیا سلائی آگ پر رکھی اور اُس کو روشن کر کے شمع دوبارہ جلا دی۔ پھر وہ سایہ آیا اور اُس نے شمع گل کر دی۔ غرض تین دفعہ یہی ہوا کہ وہ سایہ شمع گل کرتا تھا اور نانا اُس کو روشن کر دیتے تھے۔ جب تیسری دفعہ نانا نے شمع روشن کی تو ایک آدمی چھت کے اوپر سے سیڑھیاں اترتا ہوا آیا۔ اور اُس نے میرے نانا کا نام لے کر کہا۔ "سنو میاں غلام حسین میں جن ہوں۔ اور شمع کی روشنی سے مجھے تکلیف ہوتی ہے تم شمع گل کر دو۔ اور جہاں تم نے پلنگ بچھایا ہے وہاں میں رات کو نماز پڑھا کرتا ہوں۔ لہذا تم اپنا پلنگ بھی یہاں سے ہٹا لو۔ میں جانتا ہوں کہ تم ضدی آدمی ہو۔ کیونکہ میں دلی میں تمہاری درگاہ کی زیارت کے لئے کئی دفعہ جا چکا ہوں۔ مگر تم یاد رکھو کہ اس مکان میں رات کے وقت جو آدمی رہتا ہے میں اُس کو مار ڈالتا ہوں۔ تمہاری خیر اسی میں ہے کہ تم پلنگ یہاں سے ہٹا لو اور شمع گل کر دو۔ ورنہ میں تم کو مار ڈالوں گا۔ نانا نے کہا۔ بھائی جب تم جانتے ہو کہ میں ضدی آدمی ہوں تو سمجھ لو کہ جب تک جیتا ہوں نہ شمع گل کروں گا۔ نہ پلنگ ہٹاؤں گا۔ آج کی رات تو تم کسی اور جگہ نماز پڑھ لو۔

کل میں اس مکان میں نہ رہوں گا۔ یہ مرزا جہانگیر کے نوکروں نے بڑی شرارت کی کہ مجھے ایسی جگہ ٹھہرایا جہاں تم رہتے ہو۔ یہ بات سن کر وہ جن ہنسا اور اُس نے کہا۔ اچھا میاں آج کی رات میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔ مگر کل یہاں نہ رہنا۔ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔ اور دوسرے دن میرے نانا مرزا جہانگیر سے ملے اور اُن کو بہت بُرا بھلا کہا۔ کہ تم نے مجھے جنات کے مکان میں کیوں ٹھہرایا۔ اور اُسی دن الہ آباد سے دلی چلے آئے۔

چوتھا قصہ} میرے ماموں کہتے تھے کہ ہماری بستی میں ایک حلال خور رہتا تھا۔ جس کے بھوت تابع تھے۔ ہمارے چچا کو بھی بھوت تابع کرنے کا شوق ہوا اور اُس حلال خور کے پاس گئے۔ حلال خور نے کہا کسی حلال خور کو مرنے دو جب تم کو بھوت تابع کرنے کا عمل سکھاؤں گا۔ چند مہینے کے بعد کوئی حلال خور مرا (ہمارے ہاں حلال خور دفن کئے جاتے ہیں) وہ بھی دفن کر دیا گیا۔ رات کو وہ بھوتوں کا عمل جاننے والا حلال خور میرے ماموں کے چچا کے پاس آیا۔ اور اُس نے کہا۔ لو چلو۔ آج میں تمہیں بھوتوں کو تابع کرنے کا عمل سکھاؤں۔ وہ اُس کے ساتھ حلال خوروں کے قبرستان میں گئے۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ اور خوب اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ حلال خور نے تازہ قبر کی مٹی ہٹائی اور پٹاؤ کھولا۔ مرنے والے کی لاش کفن میں لپٹی ہوئی رکھی تھی۔ زندہ حلال خور نے ماموں کے چچا سے کہا۔ کہ تم اس لاش کے پیروں میں بیٹھ جاؤ اور میں سرہانے بیٹھتا ہوں۔ یہ پہلے تو بہت ڈرے۔ مگر بھوت تابع کرنے کا بھوت سر پر سوار تھا۔ ہمت کر کے لاش کے پیروں میں بیٹھ گئے۔ اور وہ حلال خور سرہانے بیٹھ گیا اور اُس نے کفن کھول کر مردہ کے دونوں ہاتھ نکالے اور ان دونوں ہاتھوں میں دو چھریاں دیدیں۔ اور اس کے بعد منتر پڑھنے لگا۔ اور کالے اڑد اس لاش پر ڈالنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لاش ہلی۔ لاش کو ہلتا ہوا دیکھ کر ماموں کے چچا ڈرے۔ لاش کے سرہانے بیٹھے ہوئے حلال خور نے ہاتھ کے اشارہ سے اُن کو ہمت دلائی۔ اور اشارہ کیا کہ بیٹھے رہو۔ ڈرو مت۔ مگر جب لاش اپنی دونوں کہنیوں کو ٹیک کر

اٹھتی ہوئی معلوم ہوئی تو ماموں کے چچا ڈر کے مارے کھڑے ہو گئے اور اُچھل کر قبر کے باہر آگئے۔ اُن کا باہر آنا تھا کہ وہ مردہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی چھریاں اُس جگہ ماریں جہاں ماموں کے چچا بیٹھے ہوتے تھے۔ مگر جب وہاں کوئی نہ ملا تو مردہ نے پیچھے مڑ کر اپنے سرہانے حلال خور کے وہ دونوں چھریاں ماریں اور حلال خور چھریوں سے زخمی ہو کر چیخا۔ اور ماموں کے چچا یہ تماشہ دیکھ کر بھاگے۔ اور اُن کا ڈر کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ تھوڑی دیر بھاگتے رہے۔ اِس کے بعد ذرا رکے۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ وہ مردہ کفن پہنے اور دونوں چھریاں ہاتھ میں اٹھائے دوڑا ہوا چلا آتا ہے۔ اور یہ بھی کہتا جاتا ہے کہ میں نے اپنی بھینٹ لے لی اور اُس آدمی کو مار ڈالا۔ اب میں تمہارا تابع دار ہوں۔ اب تمہارا جو کام ہو گا وہ میں کرونگا۔ تم ذرا ٹھہرو تو سہی۔ ٹھہرو ست۔ میں تمہارا تابع دار ہوں۔ میرے ماموں کے چچا نے بھاگتے بھاگتے جواب دیا۔ خدا کے لئے تو الٹا جا۔ مجھ کو تجھے تابعدار بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر وہ مردہ برابر پیچھے دوڑتا رہا۔ درگاہ کے دروازہ کے پاس ایک حجرہ تھا۔ اور اُس میں شاہجہاں پور کے ایک درویش رہتے تھے۔ ماموں کے چچا نے اُن کو آواز دی۔ انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ اور جب یہ اندر آ گئے تو دروازہ بند کر لیا۔ اُس مردہ نے دروازہ کے باہر کھڑے ہو کر کہنا شروع کیا۔ دروازہ کھولو۔ میں تمہارا تابع دار ہوں تم جس کام کو کہو گے وہ کام کروں گا۔

شاہجہاں پوری شاہ صاحب نے کہا۔ ہم تیری تابعداری سے بہت خوش ہوئے۔ اور تجھ کو حکم دیتے ہیں کہ یہاں سے جا۔ اور اپنی قبر میں لیٹ کر سو جا۔ اور کبھی نہ آ۔ جب تک کہ ہم تجھ کو نہ بلائیں۔ یہ سُنکر مردہ چلا گیا۔ مگر ماموں کے چچا کو تھوڑی دیر بعد غش آ گیا۔ اور وہ دس بارہ گھنٹے بے ہوش رہے۔ اور ہوش میں آئے تو کئی مہینے بیمار رہے۔ اور پھر اُنھوں نے بھوتوں کو تابع کرنے کا شوق ترک کر دیا۔ اور ساری عمر قبر کے بھوت سے اُن پر خوف طاری رہا۔

پانچواں قصہ } درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے جنوب میں ایک چھوٹا سا قلعہ بنا ہوا ہے جس کو کوٹ کہتے ہیں۔ چھ سو برس پہلے ملک تلنگانہ دکن کے ایک ہندو دلّی میں آئے اور حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیاء کے مرید ہوئے۔ اور حضرت نے اُن کا نام احمد ایاز رکھا۔ اور حضرت کی سفارش سے بادشاہ کے ہاں نوکر ہوتے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ہندوستان کی بادشاہی کے وزیر اعظم ہو گئے۔ اور انھوں نے یہ کوٹ بنوایا۔ اور اسی کوٹ کے اندر اپنا مقبرہ بھی تیار کرایا۔ جس کے اندر مرنے کے بعد دفن ہوئے۔ اِس کوٹ کی فصیل میں جگہ جگہ کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں۔ اور ان کوٹھریوں کے آگے میرے خاندان کے لوگوں نے مکانات بنوائے ہیں۔ اِس فصیل کے غربی حصہ میں دو تین کوٹھریوں سے ملے ہوئے میرے نانا سید حضور بخش صاحب مرحوم کے مکانات ہیں۔ اور ایک کوٹھری کی چھت پر ایک دو چھتی بنی ہوئی ہے۔ جس کی دوسری چھت اتنی نیچی ہے کہ آدمی کھڑا ہو کر اندر نہیں جا سکتا۔ بلکہ بیٹھ کر اندر جاتا ہے یہ دو چھتی اندر سے بہت بڑی ہے۔

آج کل حسن نظامی کی عمر ساٹھ برس کی ہے۔ میری پیدائش کے زمانہ میں یعنی آج سے ساٹھ برس پہلے اِس دو چھتی میں ایک جن عورت رہتی تھی جس کو **نانی سببیا** کہتے تھے۔ یہ عورت کسی کو دکھائی نہ دیتی تھی۔ مگر اس کی آواز سب سنتے تھے۔ وہ ناک میں بولتی تھی۔ یعنی اُس کی آواز ایسی آتی تھی جیسے کوئی ننکھنا آدمی بولتا ہے۔ کوٹ کی عورتیں اس جن عورت سے ڈرتی نہ تھیں۔ بلکہ سب اس سے مانوس تھیں۔ کیونکہ وہ جن عورت سب عورتوں سے باتیں کیا کرتی تھی۔ سب عورتیں اس کو نانی شبیا کہتی تھیں۔ اور نانی شبیا بچوں کے نانی کہنے سے بہت خوش ہوتی تھیں۔

میری اماں کہتی تھیں۔ کہ اُن کی والدہ یعنی میری نانی اس عورت کو نانی نہ کہتی تھیں۔ بلکہ بوا شبیا کہا کرتی تھیں۔ اور یہ جن عورت اُن سے بہت زیادہ باتیں کیا کرتی تھی۔ سارے کوٹ کے گھروں اور کوٹ کے باہر کے گھروں میں نانی شبیا کی دھوم تھی۔ نانی

شبیا کی کوٹھری میں آٹا پیسنے کی چکّی اور سوت کاتنے کا چرخہ رکھدیا گیا تھا۔ کوٹ کی عورتیں آتیں اور کہتیں "نانی ہمارا سوت کات دو" تو نانی شبیا جواب دیتیں۔ اچھا بیٹا روئی چرخہ کے پاس رکھدو۔ عورتیں روئی رکھدیتیں اور چرخہ خود بخود چلنے لگتا۔ اور سوت کتنے لگتا۔ اور تھوڑی دیر میں تیار ہوجاتا۔ بعض عورتیں گیہوں لاتیں اور کہتیں "نانی ہمارا آٹا پیس دو۔ نانی شبیا جواب دیتیں۔ اچھا بیٹی گیہوں چکی کے پاس رکھدو۔ تھوڑی دیر میں چکّی خود بخود چلنی شروع ہوتی۔ کوئی چلانے والا دکھائی نہ دیتا۔ اور آٹا پسنے لگتا یہاں تک کہ سب گیہوں پس جاتے اور عورتیں اپنا کتا ہوا سوت اور پسا ہوا آٹا لے جاتیں۔

اماں کہتیں تھیں تو (یعنی حسن نظامی) چھ مہینے کا تھا۔ کہ میں تجھ کو لے کر اپنی اماں کے گھر میں آئی۔ گرمی کا موسم تھا ہم سب نے چارپائیاں مکان کے صحن میں بچھالیں۔ اس زمانہ میں ہم سب تجھ کو پیار سے بچھنی (حسنی) کہتے تھے۔ یکایک نانی شبیا کی آواز آئی اور انھوں نے تیری نانی سے کہا۔ کہ بوا اپنے نواسہ بچھنی کو باہر نہ سلانا۔ کیونکہ آج میرے ہاں شہیدوں کی نیاز ہے۔ اور نیاز میں بہت سے مہمان آنے والے ہیں۔ ایسا نہ ہو کسی مہمان کی نظر تمہارے بچہ پر ہو جائے۔ نانی نے جواب دیا۔ بوا شبیا یہ کیونکر ہوسکتا ہے۔ گرمی کا موسم ہے۔ چھوٹا بچہ ہے۔ اس کو اندر گرمی میں کیونکر سلاؤں۔ وہ تو باہر ہی سوئے گا۔ نانی شبیا نے جواب دیا۔ اچھا بوا تم بچہ کو باہر سلاؤ۔ میں خیال رکھوں گی کہ کوئی مہمان بچہ کی طرف نہ جائے۔

اماں کہتی تھیں۔ ہم سب سو گئے۔ تو میرے پاس چارپائی پر سوتا تھا۔ رات کے دو بجے کا عمل ہوگا۔ کہ تیرے رونے کی آواز آئی۔ میں گھبرا کر اٹھی تو کیا دیکھتی ہوں کہ تو میری چارپائی پر نہیں ہے اور ایک دوسری چارپائی پر جو پاس ہی خالی پڑی تھی پڑا ہوا رو رہا ہے۔ میں اٹھی اور تجھ کو گود میں اٹھالیا۔ اور اپنے کلیجہ سے لگالیا۔ پھر تیری نانی کو جگایا اور اُن سے کہا۔ کہ بچھنی کو خبر نہیں کس نے دوسری چارپائی پر ڈال دیا تھا۔ نانی نے اُسی وقت نانی شبیا کو آواز دی کہ بوا شبیا دیکھو وہی ہوا نا جس کا ڈر تھا۔ میرے بچہ کو کسی نے ماں کے

پاس سے اٹھا کر دوسری چارپائی پر ڈال دیا۔ نانی شبیا نے جواب دیا۔ گھبراؤ نہیں میری بہن کو بچی پہ پیار آگیا تھا۔ اور اُس نے اٹھا کر پیار کیا تھا۔ بچہ رونے لگا تو میری بہن نے جلدی میں دوسری چارپائی پر لٹا دیا۔

بہرحال نانی شبیا کے ایسے ہی بے شمار قصے مشہور تھے۔ مگر جب میں نے ہوش سنبھالا تو نانی شبیا کی آواز نہ آتی تھی۔ اور لوگ کہتے تھے کہ نانی شبیا مر گئیں۔ میں نے نانی شبیا کے کئی قصے اپنی لائف حسن جیون میں بھی لکھے ہیں۔

بھگت کبیرؒ

یہ تقریر خواجہ حسن نظامی صاحب نے ۸ مارچ ۱۹۳۷ء کو براڈکاسٹ کی۔

آج کی بات، کون سنے گا؟ حسن نظامی دلّی میں کہہ رہا ہے۔ کہ آج کی بات بس اُس کو سُننی چاہیئے جس کو ہندوستان کی بھلائی درکار ہے اور جس کے اندر دوسری قوموں اور دوسرے مذہب والوں کے خلاف غصہ نہیں ہے۔ اور جس کو کھری بات اور سچی بات کہنے کا شوق ہے۔ اور جو دوسروں کی کھری بات سُننے کی برداشت بھی رکھتا ہے۔

میں آج ہندوستان کے سچے پریمی بھگت کبیر کا قصہ سنانے آیا ہوں۔ جن کو ہندوستان کے ایک کروڑ آدمی اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ اور کبیر پنتھی کہلاتے ہیں۔

میں بچپن سے درگاہوں کی قوالی میں بھگت کبیر کا کلام سنتا تھا۔ اور ان کی سچی اور کھری باتوں کا میرے دل پر اثر ہوتا تھا۔ اور جب دہلی براڈکاسٹنگ کا پروگرام بنانے والوں نے مجھ سے اُن کا قصہ سُنانے کی درخواست کی تو میں نے بھگت کبیر کے حالات ڈھونڈھنے شروع کئے۔ اور چند روز میں پانچ کتابیں ملیں۔ ایک کبیر بیجک دوسری جیون چرتر کبیر داس تیسری کبیر کسوٹی چوتھی کبیر داس پانچویں کبیر جنم ساکھی۔

کبیر بیجک ناگری میں ہے۔ اور لکھنؤ کے مطبع نولکشور میں چھپی ہے۔ اور کبیر پنتھی اسی کو ٹھیک سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اس میں بہت سی خلاف عقل باتیں بھی ہیں۔ جیون چرتر کبیر داس موہن لال صاحب کایستھ نے ۱۹۰۳ء میں لکھی تھی۔ اور یہ بھی کشوری مطبع لکھنؤ میں چھپی ہے۔ اس کتاب میں بے سر و پا قصوں کے علاوہ کبیر کو ہندو ثابت کرنے کی اس طرح کوشش کی گئی ہے جو مسلمانوں کو ناگوار ہوتی ہے۔ کبیر کسوٹی ۱۸۸۵ء میں پنڈت کبیر پنتھیوں نے مل کر لکھی تھی جو بمبئی کے ایک مطبع نے چھاپی ہے۔

اس میں بھی خوش اعتقادی کے جوش نے اصل حقیقت ظاہر نہیں ہونے دی۔ تاہم یہ غنیمت ہے کہ حالات اور کلام کا ذخیرہ اس میں زیادہ ہے۔

کبیر واس کتاب لالہ تیرتھ رام صاحب فیروز پوری نے اردو میں لکھی ہے اور لاہور میں چھپی ہے۔ لالہ تیرتھ رام صاحب انگریزی ناولوں کے مشہور اور کامیاب مترجم ہیں۔ مگر یہ کتاب اُنھوں نے آریہ سماجی خیالات سامنے رکھ کر لکھی ہے۔ کتاب کا کاغذ بھی خراب ہے۔ اور چھپائی ایسی ہے کہ اس کے مضامین کا سمجھنا ناممکن ہے۔

کبیر جنم ساکھی ایک مسلمان منشی محمد خلیل صاحب انصاری نے اردو میں لکھی ہے اور منشی قربان علی صاحب ایڈیٹر اردوئے معلی دہلی نے اس کو خوش خط اور اچھے کاغذ پر چھاپا ہے۔ اس کتاب میں سرکاری گزیٹروں کے اقتباسات بھی دئیے گئے ہیں۔ اور ہندو مسلمانوں کے خیالات کو بھی ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ اور کلام بھی ایسا شائع کیا ہے جو سمجھ میں آتا ہے۔ اور ہندی کلام کا اردو ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے۔ مگر اس کتاب میں بھی قومی اور مذہبی کشمکش موجود ہے۔ یعنی کبیر کو مسلمان ثابت کرنے کوشش کی گئی ہے۔ ان سب کتابوں کو پڑھنے اور سب کے بیانات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ کہ بھگت کبیر کی ماں مسلمان تھیں اور باپ برہمن تھے۔ اور ان کو برہمن اور اعلیٰ ذات کے ہندو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ ان کی ماں جولاہہ قوم کی مسلمان عورت تھیں۔ اور ہندوؤں کی پرانی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھوت ذاتیں اسی طرح پیدا ہوتی ہیں۔ کہ جب برہمن یا چھتری یا ویش اونچی ذات کے کسی مرد کا کمین ذات کی کسی عورت سے تعلق ہو جاتا تھا تو جو اولاد ان سے ہوتی تھی وہ اچھوت اور کمین سمجھی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کبیر کے بھگتوں اور ماننے والوں نے یہ تو لکھا ہے کہ کبیر نیلوفر کے پھول سے پیدا ہوئے تھے۔ اور اونچی ذات کے ہندوؤں نے یہ لکھا ہے کہ ایک بچہ پڑا ہوا مل گیا تھا۔ جس کو ایک ہندو سادھو نے پال لیا۔ اور بعض ہندوؤں نے

یہ بھی لکھا ہے کہ کبیر مسلمان گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ اور مسلمانوں میں ان کی شادی ہوئی تھی۔ اُن کی بیوی کا نام لوئی تھا۔ اور اُن کے بیٹے کا نام کمال تھا۔ اور اُن کی بیٹی کا نام کمالی تھا۔ لالہ تیرتھ رام فیروزپوری نے اُن کے مسلمان رشتہ داروں کے نام بھی لکھے ہیں۔

بھگت کبیر کی زندگی میں بھی ہندو مسلمان قومیں اپنی اپنی جگہ ان کو اپنا خیال کرتی تھیں۔ یعنی ہندو کہتے تھے کہ کبیر ہندو ہیں۔ اور مسلمان کہتے تھے کہ کبیر مسلمان ہیں۔ اور جب کبیر کا انتقال ہوا تو دونوں قوموں میں کبیر کی میت جلانے اور دفن کرنے کے مسئلہ میں جھگڑا پڑا۔ اور نوبت خوں ریزی کی آگئی۔ آخر ایک غیبی آواز سُنکر لوگوں نے بھگت کبیر کے مردہ جسم کا کپڑا اٹھایا تو وہاں لاش موجود نہ تھی بلکہ پھولوں کا ایک ڈھیر تھا۔ ان پھولوں کو ہندو مسلمانوں نے آدھا آدھا بانٹ لیا۔ ہندوؤں نے وہ پھول جلادیے اور مسلمانوں نے دفن کر دئے۔

کبیر پنتھی لوگوں کا بیان ہے کہ کبیر ۱۳۹۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اور ۱۵۱۸ء میں وفات پائی۔ گویا وہ کبیر کی عمر ایک سو بیس برس کی مانتے ہیں۔

ضلع بنارس کے سرکاری گزیٹر میں لکھا ہے کہ کبیر ضلع اعظم گڈھ کے گاؤں بلہرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے کبیر پنتھی ہونا لکھوایا ہے اُن کی تعداد علاوہ پنجاب کے آٹھ لاکھ تینتالیس ہزار ایک سو اکھتر تھی۔ اور پنجاب میں کبیر پنتھی سب صوبوں سے زیادہ ہیں۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ تعداد درست نہیں ہے۔ کیونکہ کبیر کے ماننے والے ہندوستان میں کروڑوں آدمی ہیں۔ جن میں چمار اور دھوبی اور کولی اور جولاہے بہت زیادہ ہیں۔ اور ان سب کی تعداد ایک کروڑ سے کم نہ ہوگی۔

بھگت کبیر مسلمان درویش تھے۔ مگر وہ کسی خاص قوم یا خاص فرقہ کے پابند نہیں تھے۔ اُن کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جہاں ہندوؤں کے مراسم اور ہندوؤں

کے عقائد پر نکتہ چینی کرتے ہیں وہیں مسلمانوں بعض عقائد اور مراسم پر بھی طعن کرتے ہیں۔ انھوں نے فرقہ بندی کے اختلاف کے خلاف ساری عمر کام کیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی ایسے نقرے بھی کہہ گئے جس سے اُن کی صلح پسندی ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً انھوں نے ایک مرتبہ کہا

مندر اندر بامن پوجے تُرک اندر شیخا کہیں کبیر سنو بھی سادھو جیسے کو تیسا

یعنی انھوں نے ہندو مسلمانوں کی خدا پرستی کے اختلاف کا یہ کہہ کر فیصلہ کر دیا کہ خدا کو کسی طریقہ سے بھی پوجو خدا اُسی طریقہ سے بندہ کی پوجا قبول کر لیتا ہے۔

ذات پات کبیر کے حالات پر فلسفیانہ نظر سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا چونکہ اونچی ذاتوں کے ہندو کبیر کو اور اُن جیسے سب لوگوں کو حقیر سمجھتے تھے۔ اس لئے کبیر نے ذات پات کا بندھن توڑنے کے لئے بہت زیادہ کوشش کی تھی۔ اور اچھوت قوموں میں اُن کی ہر دل عزیزی کا راز یہی تھا کہ کبیر وہ بات کہتے تھے جو اچھوت قوموں کے دلوں میں چھپی ہوتی تھی۔

اچھوتوں کی آزادی اور ترقی کا کبیر کو بہت زیادہ خیال تھا۔ اگر کبیر کے بعد اُن کی تحریک کو چلانے والے اس تحریک کو مذہبی نہ بنا دیتے تو ہندوستان میں اچھوتوں کی حالت بہت کچھ سنبھل جاتی۔

سکھ مذہب کی بنیاد بھگت کبیر کے حالات کی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرو نانک صاحب کبیر کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ اور انھوں نے سکھ مذہب کی بنیاد رکھتے وقت بھگت کبیر کے خیالات سے بہت زیادہ کام لیا تھا۔ گرنتھ صاحب میں بھی کبیر کے اشعار بکثرت موجود ہیں۔ اور ذات پات کے بندھن کے خلاف گرو نانک صاحب نے سب کچھ کبیر کے خیالات کی تائید میں کام کیا ہے۔ پس اگر سکھوں کو بھی کبیر کا ماننے والا کہا جائے تو غلط دعویٰ نہ ہوگا۔

بنارس کے سرکاری گزیٹر سے معلوم ہوتا ہے کہ بھگت کبیر سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں موجود تھے۔ ۱۴۸۸ء میں سلطان سکندر لودی ہندوستان میں حکومت کرتا تھا اور گرونانک صاحب لودی حکومت کے خاتمہ کے بعد شہنشاہ بابر کے زمانہ میں ہوئے ہیں۔

بھگت کبیر کا کلام بت پرستی کی نسبت کہتے ہیں۔

پتھر پوجے ہر ملے تو ہم پوجیں پہاڑ ۔۔۔ اس سے تو چکی بھلی کہ پیس کھائے سنسار

یعنی اگر پتھر پوجنے سے خدا مل جاتا۔ تو کبیر کہتے ہیں کہ "میں پتھر کا چھوٹا سا بت نہ پوجتا۔ بلکہ پتھر کے بڑے پہاڑ کو پوجتا۔ پھر کہتے ہیں کہ بت کے پتھر سے تو چکی کا پتھر اچھا۔ کہ اُس سے ساری دنیا آٹا پیس کر کھاتی ہے۔ پتھر کے بت سے تو اتنا فائدہ بھی آدمیوں کو نہیں ہوتا۔

دنیا کی تمام اشیاء کو مٹتے اور فنا ہوتے دیکھ کر کبیر کے غور کرنے والے دل پر جو اثر ہوا اُس کو اس شعر میں ادا کیا ہے۔

چلتی چاکی دیکھ کر دیا کبیرا روئے ۔۔۔ دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوئے

یعنی جب میں نے چکی کے دونوں پاٹوں کو چلتا ہوا اور آٹا پیستا ہوا دیکھا تو مجھے رونا آگیا کہ ان دونوں پاٹوں کے بیچ میں دانہ جو وہ باقی نہ رہا۔ اور فنا ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان اور زمین چکی کے دو پاٹ ہیں۔ اور دونوں چل رہے ہیں۔ اور دونوں کے بیچ میں فنا کا بازار گرم ہے۔

اسی طرح بھگت کبیر نے مرکز پر قائم رہنے کے فائدہ کو جیسی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ وہ سننے اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہتے ہیں۔

چاکی چاکی سب کہیں مانی کہے نہ کوئے ۔۔۔ مانی سے جو لگ رہا بال نہ بیکا ہوئے

یعنی آٹا پیسنے کی چکی کو دیکھ کر سب چکی کہتے ہیں کہ چکی ہے۔ مگر یہ بات کوئی نہیں کہتا کہ چکی مانی کے سہارے چل رہی ہے۔ اس سے اس کو مانی کہنا چاہئے۔ (چکی کے بیچ کے

پاٹ میں ایک کیل لگی رہتی ہے۔ اور اس کیل کے سہارے اوپر کا پاٹ پہیا آسن ہے۔ اس کیل کو ہندی میں مانی کہتے ہیں۔ کبیر نے چکی کا چلنا بہت غور سے دیکھا ہوگا۔ جو دانے مانی کے پاس آجاتے ہیں ان کو چکی کے پاٹ نہیں پیس سکتے۔ اور وہ قائم رہتے ہیں کبیر نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ جو آدمی خدا کو اپنا مرکز بنا لیتا ہے۔ یا دنیا میں کوئی مرکز مقرر کر لیتا ہے اور اُس کے سایہ میں آجاتا ہے تو دنیا کے چکر کی تکلیفوں سے بچ جاتا ہے۔ جیسے کہ چکی کے دونوں پاٹوں کے چلنے سے غلہ کا وہ دانہ نہیں پستا جو مانی کی آڑ میں پناہ لے لیتا ہے۔

ایک جگہ فانی چیزوں کے پوجنے اور خدا کی باقی رہنے والی ذات کی پوجا کے فرق کی نسبت یہ خیال ظاہر کرتے ہیں۔

ٹھاکر پتھر مالا لکڑ تیرتھ ہیں سب پانی	راما کرشنا مر گئے دیکھے چاروں وید کہانی
راما مر گئے کرشنا مر گئے۔ مر گئی لکھو باتی	اُس کو سادھو کیوں نہیں پوجو جس کو موت نہ آتی

یعنی بُت اور پوجنے کے پتھر اور تسبیح اور پیپل اور گنگا اور جمنا سب کو ننا ہے۔ چاروں وید بھی دیکھ لئے وہ بھی ایک کہانی ہیں۔ رامچندر جی اور کرشن جی اور لکھو باتی کو بھی موت آگئی۔ پھر اے فقیرو اُس کو کیوں نہیں پوجتے جس کو موت نہیں آتی۔

جو پیدائشی بُرا ہو اُس کو نیک بنانے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کڑوے نیم کی جڑ میں گڑ اور گھی یہ سمجھ کر ڈالے کہ اُن سے نیم کی کڑواہٹ جاتی رہے گی اس کو کہتے ہیں

جا کی جیسی بھاؤ جانے نہ جی سے	نیم نہ میٹھا ہوت سینچے گڑ گھی سے

دوسری جگہ اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ عقل خدا جس کو چاہتا ہے اُس کو دیتا ہے۔ اور جب خدا چاہتا ہے تو عقلمندوں کی سمجھ کو چھین لیتا ہے۔ کہتے ہیں۔

جیسی کرنی دیو کی ویسی آپ بے بدھ	ہونہار ہروے ییسے بسر جات سب سدھ

ایک جگہ انسانی جسم کے چاروں عناصر سے بالا ہو کر خدا کا دھیان کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ فرمایا ہے۔

چو مجھے کھنڈ چڑھ کرے جو باسا ؎ مرن جیون کا رہے نہ سانسا ؎

یعنی جو شخص آگ پانی اور ہوا، خاک کے جسمانی عناصر سے اونچا ہو کر خدا کو یاد کرے تو پھر اُس کو مرنے جینے کا خوف نہیں رہتا۔

دنیا کی زندگی میں سب آدمی اپنی اپنی حد کے اندر رہتے ہیں۔ اور حد کے باہر آج تک کوئی نہیں گیا۔ مگر کبیر کہتے ہیں کہ میں دنیا کی مقررہ سرحد سے بھی آگے بڑھا۔ اور اَن حد کے میدان میں جاکر سو گیا۔ فرمایا ہے۔

حد حد کرتے سب گئے اور اَن حد گیا نہ کوئے

اَن حد کے میدان میں رہا کبیرا سوئے

کبیر کے زمانہ میں ہندو مسلمان دونوں خدا پرستی کا دعویٰ کرتے تھے۔ اور کبیر سے پہلے بھی دنیا کے سب آدمی اپنی اپنی زبان میں خدا کا نام لیتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے اس بات پر لڑتے تھے کہ وہ بھی خدا کا اسی زبان میں نام لیں کہ جس زبان میں وہ خدا کا نام لیتے ہیں۔ بھگت کبیر نے آپس کے یہ جھگڑے دیکھے تو انھوں نے بہت مزہ دار ڈھنگ سے اس بُرائی کو ظاہر کیا۔ کہتے ہیں۔

کبیر بھلا ہوا ہر بسرے سر سے ٹلی بلا　　ہر ہمارا ہمیں جپے ہماری جپے بلا

یعنی اے کبیر بہت اچھا ہوا کہ میں خدا کو بھول گیا۔ اور میرے سر سے ہر کو یعنی خدا کو یاد کرنے کی ذمہ داری کی بلا ٹل گئی۔ خدا تو خود اپنی مخلوق کا نام جپتا ہے ہمیں کیا پڑی جو ہم اُس کا نام جپنے کی فکر کریں۔

جو لوگ تصوف اور سلوک کے مقامات سے واقف ہیں وہ کبیر کے اس کلام کا مزہ اٹھائیں گے۔ کیونکہ اگرچہ بظاہر یہ کلام گستاخانہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبیر خدا کا نام لینے سے منکر ہو گئے ہیں۔ مگر درحقیقت اس شعر میں کبیر نے تصوف کے اُس مقام کو بیان کیا ہے جہاں بندہ اپنے وجود اور خودی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور اُس کے

احساسِ ذاتی میں اُس کی خودی باقی نہیں رہتی۔ اِس شعر میں بڑی لطافت اور ادبی خوبیوں کے ساتھ ایک بہت بڑے مسئلہ کو کبیر نے بیان کیا ہے۔ میں اپنے ہاں قوالی کی مجلسوں میں کبیر کا یہ کلام بار بار سنتا ہوں۔ اور صوفیوں کو اس پر وجد و حال آتا ہے۔

بھگت کبیر نے بھی گوتم بدھ کی طرح اِس دنیا کو دُکھ سے بھرا ہوا سمجھا تھا۔ کہتے ہیں۔

تن دھر سکھیا کوئی نہ دیکھا جو دیکھا سو دُکھیا رے

ڈگر چلتی سب گھٹ دُکھیا کیا گرہی اور بیراگی رے ؛؛

اونچے چڑھ چڑھ دیکھا تماشہ گھر گھر ایک ہی لیکھا رے

چاند دکھت ہے۔ سورج دُکھیا نس دن مت پھر جائے رے

یعنی دنیا کے کسی جسم والے کو سُکھ اور خوشی میں نہ دیکھا سب دُکھ میں مبتلا ہیں۔ زندگی کے راستہ پر چلنے والے سب دکھیا ہیں۔ چاہے گھر دار ہوں چاہے تارک دنیا ہوں۔ ذرا اونچے پر چڑھ کر دنیا کے سب گھروں کا تماشہ دیکھو۔ صاف نظر آجائے گا کہ سب کے سب ایک ہی حال میں مبتلا ہیں۔ یہاں تک کہ آسمان کے چاند سورج بھی دُکھ میں پھنسے ہوئے ہیں۔

ذات پات کے اختلاف کی نسبت اُن کے بہت سے اشعار ہیں۔ مگر ایک شعر ایسا ہے جو حضرت جامی کے اِس فارسی شعر کی طرح مشہور ہے اور ہر ہندو مسلمان کی زبان پر ہے۔ جامی کہتے ہیں ؎

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی   کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

یعنی اے جامی اگر تو خدا کی محبت کا حلقہ بگوش ہو گیا ہے تو اپنے نسب اور جنم کی بڑائی کے خیال کو چھوڑ دے کہ محبت کے راستہ میں یہ بات کہ فلاں آدمی فلاں کا بیٹا ہے کچھ حقیقت نہیں رکھتی کبیر اس مضمون کی نسبت کہتے ہیں۔

ذات پات پوچھے نا کوئے   ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے ؛؛

یعنی خدا کا وہی بندہ مقبول ہوتا ہے جو خدا کو یاد کرتا ہے۔ اِس معاملہ میں ذات پات کو کوئی نہیں دیکھتا

اور کوئی نہیں پوچھتا۔ کہ فلاں سید ہے۔ فلاں برہمن ہے اس لئے وہ خدا کا پیارا ہے۔ کبیر کہتے ہیں نہیں۔ خدا کا پیارا وہی ہے۔ جو خدا کو یاد کرے۔ چاہے وہ کیسی ہی ادنیٰ ذات کا ہو۔

خلاصہ} اس بات چیت کا خلاصہ مطلب یہ ہے۔ کہ بھگت کبیر ہندو مسلمانوں کے جھگڑوں سے پاک تھے۔ اور ہندو مسلمان بھی ان کو غیر اور پرایا خیال نہ کرتے تھے۔ اور وہ ہندوستان کی اس بات کے خلاف تھے۔ کہ یہاں ذات پات کا بندھن حد سے بڑھ گیا ہے۔ وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ اور مسلمان تھے۔ اور مسلمانوں میں اُن کی شادی ہوئی تھی۔ اور اُن کی اولاد بھی مسلمان تھی۔ لیکن اُن کو ہندو قوم کے اچھوتوں کی ترقی اور اصلاح کا اتنا زیادہ خیال تھا کہ لوگ اُن کو ہندو سمجھنے لگے تھے۔ اور یہ بیان درست نہیں ہے کہ وہ سوامی رامانند کے چیلے ہو گئے تھے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ وہ ہندو مسلمان درویشوں کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ اور امیروں کے مقابلہ میں غریبوں کے ساتھ اُن کو زیادہ محبت تھی۔ اُن کے دل میں مخلوق کا درد بھی بہت تھا۔ اور وہ ہمیشہ دنیا والوں کے دُکھ درد پر غور کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے غریبوں کو خوش حال زندگی بسر کرنے کے بہت آسان سبق دئے ہیں۔ اور اچھوت ذاتوں کا دل بڑھانے اور اُن کو آدمی کا درجہ دینے کے لئے تو بھگت کبیر ساری عمر کام کرتے رہے پس آج کل جو لوگ اچھوت سدھار کا کام کرنا چاہتے ہیں وہ بھگت کبیر کے حالات پر غور کریں۔ اُن کو اچھوتوں کی اصلی خواہشوں کا حال بھی معلوم ہو جائے گا۔ اور وہ کبیر کے اصول بیان سے اچھوت سدھار کا کام بھی ایسا کر سکیں گے جو اچھوتوں کو سچ مچ فائدہ پہنچے۔

کبیر کا یہ مضمون ختم کرنے سے پہلے مجھ حسن نظامی کو یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بڑے ہندوستانی کے حالات بیان کرنے کے لئے تو کئی برس کا وقت درکار ہے۔ پندرہ منٹ میں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے جتنا کہا گیا۔

غالب کا حلیہ

جو ۱۶ فروری ۱۹۳۶ء کی شام کو خواجہ صاحب نے دلّی ریڈیو کے ذریعہ تمام دنیا کو سنایا۔

نواب اسد اللہ خاں غالب کی قبر میرے گھر سے سو قدم کے فاصلہ پر جانب شرق واقع ہے۔ اور میں نے جس مکتب میں تعلیم پائی تھی وہ تو اس قبر کے سامنے ہے۔ مرزا غالب کے سرہانے پچاس برس پہلے جب میری عمر ۹ سال کی تھی گوندنی کا ایک درخت تھا۔ مکتب سے چھٹی ملتی تو میں اس درخت کی گوندنیاں قبر کے پاس بیٹھ کر کھایا کرتا تھا۔ اگر شاعری کی شریعت میں اس کو شاگردی کہہ سکتے ہوں تو میں اس طرح غالب کا شاگرد بھی ہوں۔

یکم فروری ۱۹۳۶ء کو دہلی براڈ کاسٹنگ کی فرمائش پر غالب کا حلیہ لکھنا چاہا تو سورج نکلنے سے ایک گھنٹہ پہلے مزار غالب پر گیا۔ خاصہ اندھیرا تھا۔ سردی ایسی کہ دانت سے دانت بجتے تھے۔ مزار غالب کے پائین کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ کتنے بڑے ہندوستانی شاعر کی قبر ہے۔ جو ہر ہندوستانی کو پیارا ہے۔ اور ہر قوم اُس کو چاہتی ہے۔ مگر میں نے اُس کو دیکھا نہ تھا۔ اُس کا حلیہ کیونکر لکھوں؟ یکایک تصور کے کان میں ایسی آواز آئی کہ کوئی مجھے پکارتا ہے۔ دل نے کہا ہو نہو اُستاد غالب پکار رہے ہیں۔ گوش ہوش سے سنوں کیا کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوا گویا کہتے ہیں۔

ارے بھائی اس سردی میں تو کہاں آگیا؟ کیا یہ وقت اِن ویرانوں میں آنے کا ہے؟ میری طرف سے کسی نے جواب دیا۔ اُستاد تمہارا حلیہ لکھنا ہے۔ صورت کا۔ سیرت کا۔ جینے کا۔ رہنے سہنے کا۔ تصور اور خیال کے کان میں آواز آئی

صاحبزادہ! تم کو تو اُس دن سے جانتا ہوں جب گوندنیاں کھانے آیا کرتے تھے۔ اور جب پنجاب کے اقبال و نیرنگ کو لے کر آتے تھے۔ اور ولایت خاں قوال سے میرے پہلو میں بیٹھ کر میری یہ غزل سنی تھی۔ کہ

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؟ اُٹھیے کہ بس اب لذتِ خوابِ سحر گئی

اور جب تم غالب کا روزنامچہ کتاب لکھ رہے تھے تب بھی میری روح تمہارے قریب بیٹھی مسکرایا کرتی تھی۔ اور مزار خسروؒ کے قریب تو بارہا میری روح نے تم کو دیکھا ہے۔

تم چاہتے ہو کہ میرا حلیہ اور میری دُکھ بھری زندگی کی تصویر نثر میں دکھاؤ تو لو میں اپنی بول چال میں اور خاص اپنے ہی الفاظ میں تمہاری تحریر کے اندر آکر بولنے لگتا ہوں۔ تاکہ سب پڑھنے والوں اور سُننے والوں کے سامنے میری بولتی چالتی شکل آجائے۔

پہلے میرا زندگی نامہ میری زبان سے یوں سُنانا۔ اور کہہ دینا کس نے کہا تھا کہ غالب مرگیا۔ قبر میں گڑ گیا۔ بھائی میں تو زندہ ہوں اور ہندوستان کے ہر گھر میں موجود ہوں۔ میرا حلیہ تم کیا لکھو گے۔ میرے ہی لکھے ہوئے الفاظ لکھ دو۔

سُنو! میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا۔ سلطنت ضعیف ہوگئی تھی صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالہ کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اُس کے جو طوائف الملوکی کا بازار گرم تھا۔ وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدرآباد جاکر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصر اللہ بیگ خاں میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا۔ اُس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا۔ صوبہ داری کمشنری ہوگئی۔ اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سواروں کا برگیڈیر مقرر ہوا۔ ایک ہزار روپیہ ذات کا۔ اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے سال کی جاگیر حین حیات علاوہ رسالہ کے تھی کہ بمرگ ناگہاں مرگیا۔ رسالہ برطرف ہوگیا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہوگئی۔ وہ اب

تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا۔ نواب گورنر جنرل سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی۔ یعنی گورنر جنرل سے ملاقات ہوئی۔ سات پارچے اور جِغہ سرپیچ۔ مالائے مروارید یہ تین رقم کا خلعت ملا۔ زاں بعد جب دلّی میں دربار ہوا مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔ میری بریت کی درخواست گزری تحقیقات ہوتی رہی۔ تین برس بعد پنڈ چھٹا۔ خلعت معمولی ملا۔ باشد۔ بدگمانی تو دور ہوئی۔ خیال تو حاکموں کا صاف ہوا۔ یہ تو میرا زندگی نامہ اور اس کی مختصر سرگزشت تھی۔ اب حلیہ چاہتے ہو تو لو سنو! وہ بھی مجھ ہی سے سنو!

غالب کا حلیہ کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا۔ اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا وہ رنگ یاد آجاتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ کیونکہ اس بھونڈے شہر دلّی میں ایک وردی ہے عام۔ ملّا۔ حافظ۔ بساطی۔ نیچہ بند دھوبی۔ سقّے۔ بھٹیارے۔ جلاہے۔ کنجڑے۔ منہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔

اب تم میرے بیان کی جو میرے وجود کا مجمل خاکہ ہے۔ تفصیل لکھنی چاہو تو لکھدو کہ میں خوب گورا سرخ و سفید جوانی میں تھا قمری کے محبوب سرو سے قد ملتا جلتا تھا چہرہ ترکانہ پیشانی چوڑی اور بلند۔ آنکھیں بڑی بھی طرح دار بھی۔ چمکیلی اور مخمور بھی۔ ناک اونچی سیدھی۔ رخسار بچپن میں اور جوانی میں دانۂ انار بڑھاپا آیا تو سفید اور زار و نزار۔ سینہ چوڑا جس کے پہلو میں درد سے بھرپور دل۔ بڑا بھی۔ سوز و گداز سے لبریز بھی۔ اور سلطنت اُجڑ جانے۔ بڑوں کا نام و نشان مٹ جانے اور نظر بازوں کی نشانہ بازی سے پاش پاش۔ زخمی اور نڈھال بھی۔ سر

میں ایک دماغ۔ دماغ میں ایک چراغ۔ رات دن روشن رہتا تھا۔ ہزاروں دماغوں کے چراغ اس اُٹھائے چراغ سے روشن ہوتے تھے۔ دانت موتی تھے۔ وقت کے رواج سے ان پر مسّی ملتا تھا۔ کہ اجالے میں ہلکا سا ابر بھی رہے۔ اور مسّی کے سہارے دانتوں کی چمک اچھی معلوم ہو

مذہب } نہ ہندو نہ مسلمان۔ عیسائی نہ موسائی۔ شیعہ نہ سُنّی۔ بڑے تلوار کو پوجتے تھے۔ میں نے قلم کو بھی بُت خانہ میں بٹھایا ہے۔ ایک کو مانتا ہوں۔ ایک کو دیکھتا ہوں۔ ایک کو پاتا ہوں ایک ہی سے دل لگانے میں مزہ آتا ہے۔ سپاہی زادہ کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ قلم سے جی لگایا تو علی اسد اللہ کی ادا جی کو بھا گئی۔ وہ یدُ اللہ تھے۔ باب العلوم تھے۔ مالکِ سیف و قلم تھے اُن کو مولیٰ بنا لینے سے ایک کا ہو گیا۔ ایک کا بن گیا۔ یہ تو عقیدت کا ایک ٹھکانا بنایا ہے۔ ورنہ میرا دین و ایمان تو انسان کی ذات اور اس کی خدمت و محبت ہے۔ آدمی ہوں تو آدمی کو چاہوں گا اور آدمیت سے باہر جو کچھ ہو اس سے سو سو کوس دور رہوں گا۔ (یہ حسن نظامی کے فقرے تھے)

طبیعت } علم و شعر سے عاری ہوں۔ لیکن پچپن برس سے محو سخن گزاری ہوں۔ مبدأ فیاض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی اور سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہلِ پارس کے منطق کا مزہ بھی ابدی لایا ہوں۔ مناسبت خداداد۔ تربیت استاد حسن و قبح ترکیب پہچاننے فارسی کے غوامض جاننے لگا۔

کلام } میرا کلام۔ کیا نظم، کیا نثر۔ کیا اردو۔ کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا۔ کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو اُن کے لاکھوں روپے کے گھر لٹ گئے جن میں ہزاروں روپے کے کتب خانے بھی گئے اس میں یہ مجموعہ ہائے پریشاں بھی غارت ہوئے۔

غدر کی تاریخ } میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی ۱۵ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے۔ اور اس کا التزام کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی عربی لفظ نہ آئے۔ جو نظم اس نثر میں درج ہے

وہ بے آمیزش نفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے۔ اس کا نام دستنبو رکھا ہے۔

غالب نظامی تھے } میاں نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم صاحبؒ کی۔ اور وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحبؒ کے۔ اور مولوی فخر الدین صاحب تھے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے سلسلۂ نظامیہ کے۔ اور میں مرید ہوں اس چشتیہ نظامیہ خاندان کا۔

شرکت مشاعرہ } مشاعرہ یہاں شہر دہلی میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعہ میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں کبھی نہیں جاتا۔ اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے اب کے ہو اب کے نہ ہو۔

دلی شہر } میرے حال میں میرے شہر دلی کا حال بھی لکھنا چاہو کہ میرے آخری وقت میں اس کا کیا حال تھا تو میری یہ عبارت نقل کر دو۔

کہتے ہیں دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ مگر اب یہ وہ دلی نہیں ہے۔ بلکہ ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ۔ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا۔ سو روپے کا پنشن دار۔ سو روپے مہینہ کا روزینہ دار بن کر نامراد بن گیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ۔ نانا کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے۔ بیمار پڑا۔ نہ دوا نہ غذا۔ انجام کار مر گیا ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آ گیا ہے۔ اس کے پاس ایک پیسا نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھئے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڑے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جاں کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدین کی پانچ سو روپے کی املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ خراب پھر لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش بیس تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں

شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی کیوں پایا جاتے ؟

مسلمان امیروں میں تین آدمی حسن علی خاں۔ نواب حامد علی خاں۔ حکیم احسن اللہ خاں سو ان کا یہ حال ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں اور کپڑا ہے تو روٹی نہیں۔

پرسوں فرخ مرزا آیا۔ اُس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ پوچھا کیوں صاحب میں تمہارا کون ہوں ؟ اور تم میرے کون ہو ؟ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ حضرت آپ میرے دادا اور میں آپ کا پوتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تمہاری تنخواہ آئی ؟ کہا۔ جناب عالی آکا جان کی تنخواہ آگئی ہے میری نہیں آئی۔ میں نے کہا۔ لوہارو جاتے تو تنخواہ پاتے۔ کہا۔ حضرت میں تو آکا جان سے روز کہتا ہوں۔ لہارو چلو۔ اپنی حکومت چھوڑ کر دلّی کی رعیت میں کیوں مل گئے ؟

سبحان اللہ۔ بالشت بھر کا لڑکا۔ اور یہ فہم درست۔ اور یہ طبع سلیم۔ میں اُس کی خوبی خو اور فرخی سیرت پر نظر کرکے اُس کو فرخ سیر کہتا ہوں۔ (حسن نظامی کہتا ہے۔ فرخ مرزا ہز ہائی نس نواب سر امیر الدین احمد خاں کا نام ہے۔ جو اسی سال انتقال کر گئے اور ریاست لہارو میں دفن ہوئے

دلّی کا حُلیہ } ارے میاں سُنتے ہو یا سو گئے ؟ تم مجھ سے دلّی کا حال سُن رہے تھے فرخ مرزا کا ذکر تو یوں ہی بیچ میں آگیا تھا۔ ہاں تو سُنو ! کل پنجشنبہ ۲۵ رمئی ۱۸۵۵ء کو اول روز پہلے بڑے زور کی آندھی آئی۔ پھر خوب مینہ برسا۔ وہ جاڑا پڑا کہ تمام شہر کرۂ زمہریر ہوگیا۔ بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچہ کا بقیہ مٹایا گیا۔ فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں جن کو عوام کنگری کہتے ہیں ان کو ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنا ڈھادی۔ اینٹ سے اینٹ بجادی۔

ریگستان کے ملک سے ایک سردارزادہ۔ کثیر العیال عسیر الحال عربی، فارسی، انگریزی تین زبانوں کا عالم دلّی میں وارد ہوا ہے۔ بلی ماروں کے محلہ میں ٹھہرا ہے۔ بحسب ضرورت حکام شہر سے مل لیا ہے۔ باقی گھر کا دروازہ بند کئے بیٹھا رہتا ہے۔ گاہ گاہ نہ ہر شام و پگاہ غالب علی شاہ کے تکیہ پر آجاتا ہے۔

حکام کا شبہ مجھ پر انگریز حکام کو بڑا شبہ تھا۔ کہ بہادر شاہ کا اس نے سکہ کہا اور مصاحب بنا۔ پنشن بند۔ دربار بند۔ گورنر جنرل نے صاف کہدیا کہ تم سے ملنا منظور نہیں۔ مگر میں نے رفع شک کی کوشش جاری رکھی۔ آخر میرا پنشن کھلا۔ چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔ آئندہ کو بدستور بے کم وکاست جاری ہوا۔ نواب لفٹننٹ گورنر بہادر نے بلا لیا۔ حاضر ہوا۔ تصور میں کیا بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی۔ یعنی عنایت سے عنایت۔ اخلاق سے اخلاق وقت رخصت خلعت دیا۔ اور فرمایا کہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے از راہ محبت دیتے ہیں۔ اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ گورنر جنرل کے دربار میں تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا۔ انبالہ دربار میں شریک ہونا خلعت لینا۔

مہجور کی یاد بھئی واہ کیا آدمی ہو۔ میری باتیں لکھے چلے جاتے ہو۔ میرے شہر دلی کے اُن مقتولوں کا حال نہیں لکھتے جن کی یاد اور ہجر و فراق نے کلیجہ پر ناسور ڈال دئے ہیں۔

مظفر الدولہ۔ میر ناصر الدین۔ مرزا عاشور بیگ میرا بھانجہ۔ اُس کا بیٹا۔ احمد مرزا انیس برس کا بچہ۔ مصطفےٰ خاں، ابن اعظم الدولہ۔ اُس کے دو بیٹے ارتضےٰ خاں اور مرتضےٰ خاں قاضی فیض اللہ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کی برابر نہیں جانتا تھا۔ اے لو بھول گیا حکیم احسن الدین خاں، میر احمد حسین میکش اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں سب مارے گئے۔ غم فراق حسین مرزا میر مہدی۔ میر سرفراز حسین۔ میرن صاحب کہ جیتے ہیں خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے۔ گھر ان کے بے چراغ۔ وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے۔ مگر میں علیؑ کو گواہ کرکے کہتا ہوں۔ کہ ان اموات کے غم و اندوہ کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

بھائی فضلو عرب سرا میں رہتے ہیں۔ پرسوں سے آئے ہوئے ہیں۔ دوڑتے پھرتے ہیں۔ عرضیاں دیتے پھرتے ہیں۔ شہر میں آمد و رفت پر ٹکٹ تھا۔ وہ اب موقوف ہوگیا۔ ہاں فقیر اندر نہ آتے اور کوئی ہتھیار لیکر نہ آتے۔ باقی ہندو مسلمان، عورت، مرد۔ سوار پیادہ جو چاہے چلا آئے۔ چلا جائے۔

غالب کی کتابیں } میری کتابوں کا حال کیا پوچھتے ہو۔ پنج آہنگ کے دو چھاپے ہیں۔ ایک بادشاہی چھاپہ خانہ کا۔ اور ایک منشی نور الدین کے چھاپہ خانہ کا۔ پہلا ناقص ہے۔ دوسرا سراسر غلط ہے۔ ضیاء الدین خاں جاگیر دار لہارو میرے بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں۔ جو نظم و نثر میں نے لکھا وہ انھوں نے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ کلیات نظم فارسی چون پچپن جزو اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز اور دیوان ریختہ سب مل کر سو سوا سو جز مسطلا و مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ کوئی ڈیڑھ دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب ایک جا ہے۔ پھر ایک شاہزادہ نے اس مجموعۂ نظم و نثر کی نقل لی۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور یہ شہر لٹے۔ وہ دونوں جگہ کا کتب خانہ خوان یغما ہوگیا۔ ہرچند میں نے آدمی دوڑائے۔ کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی وہ سب قلمی ہیں۔

دن بھر لفافے بناتا ہوں } اللہ اللہ یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ کہ مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا کہ جن کو لکھتا تھا وہ پھانسی پر لٹک گئے تو لفافے بنا بنا کر جی بہلاؤں گا۔ اِس پر اُن کا پتہ لکھتا جن کے گولی لگی۔ یہ اُن کے نام بھیجتا جن کو پھانسی ہوئی۔ اِس لفافہ پر اُن کا نام لکھدیتا اگر جانتا کہ وہ کہاں ہیں۔ اور ہیں بھی یا مر گئے۔ جنگل میں کسی درندہ نے ختم کر دیا۔ مرنے والوں کا بھی تو ٹھکانا معلوم نہیں کہاں ڈال دیا۔ کہاں داب دیا۔ ورنہ اُنہی کو لکھتا۔ یہاں کا حال۔ زمیں سخت ہے آسماں دور ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے تونگر غرور سے مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے۔ مجھے آبکاری کے بندوبست جدید نے مارا۔ عرق کے نہ کھینچنے کی قید شدید نے مارا۔ اودھر انسداد دروازۂ آبکاری ہے۔ اُودھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔

حسن نظامی بس کر لکھ چکا غالب کی لکھی ہوئی عبارتیں نقل کر چکا۔ اپنی حاشیہ نویسی کا زور بھی دکھا دیا۔ جہاں سے سنا رہا ہے وہاں کی پابندی کو بھی جانتا ہے۔ کہ یہاں ایک ایک منٹ اور ایک ایک سکنڈ کا حساب لکھا جاتا ہے۔ یہ سرکاری کارخانہ ہے کیا تو نے اس کو بھی

دبکئی اور بٹی اور زردوزی اور زرکوبی کا کارخانہ سمجھا ہے کہ بولنے بیٹھا تو بولے چلا جاتا ہے اور کارخانہ والے ہیں کہ جھوم رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں۔ کہ اچھا پھر کیا ہوا۔ اور کہو بات بیچ میں کیوں چھوڑے دیتے ہو۔ تمہاری بول چال میں تو بڑا مزہ آتا ہے۔

لو اُستاد غالب میں تمہاری داستان ختم کرتا ہوں۔ جو آسمانی لہروں کے ذریعہ دنیا کے ہر سُن سکنے والے باشندہ نے سُن لی۔ کسی نے آہ کی۔ کسی نے واہ۔ اور جب مولانا آداب عرض نے کہا۔ خواجہ حسن نظامی کی تقریر آپ نے سُنی۔ تو سُننے والے چونکے۔ کہ ایلو وہ تو کہہ چکے یہ تو وہ بولنے لگے جو کہا کرتے ہیں اچھا آداب عرض کرتا ہوں۔

میاں کیا چاہتا ہے؟

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کی تقریر جو ۲۶ فروری ۱۹۳۶ء کو دہلی ریڈیو کے ذریعہ تمام ہندوستان نے سُنی اور ہر جگہ سے اظہار پسندیدگی ہوا

ایک میاں بھائی پوچھتے ہیں۔ کیوں میاں جی یہ تو بتاؤ کہ میاں کیا چاہتا ہے؟ میاں جی جواب دیتے ہیں۔ آپ کے اس سوال کا کیا مطلب ہے؟ میں کیا جانوں کہ بیوی کیا چاہتی ہے اور میاں کیا چاہتا ہے؟ کہتے نہیں۔ کہ جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ اور قاضی جی دُبلے کیوں؟ قاضی جی بولے "شہر کے اندیشہ سے" تمہیں کیا پڑی کہ بیوی کیا نہیں چاہتی؟ اور میاں کیا نہیں چاہتا؟ اور بیوی کیا چاہتی ہے۔ اور میاں کیا چاہتا ہے؟

میں تو بس اتنا جانتا ہوں۔ کہ بیوی چاہتی ہے میاں۔ اور میاں چاہتا ہے بیوی قرآن مجید نے کہا تھا۔ پاک میاں کے لئے پاک بیوی اور پاک بیوی کے لئے پاک میاں۔ اور بُرے میاں کے لئے بُری بیوی۔ اور بُری بیوی کے لئے بُرا میاں۔ بس یہی اس دنیا میں ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ مگر دُنیا والوں کا حال آج کل کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ سب دوسروں کے فکر میں گھلے جاتے ہیں۔ اپنا فکر کوئی نہیں کرتا۔ میاں کہتے ہیں "قلندر علی کی بیوی بہت بُری" بیوی کہتی ہیں کہ "سکینہ خانم کے میاں بہت خراب" کوئی پوچھے کہ میاں کو قلندر علی کی بیوی کی نیکی بدی سے کیا سروکار۔ اور بیوی کو سکینہ خانم کے میاں کی اچھائی بُرائی سے کیا واسطہ؟ مگر وہ تو اخبار پڑھ پڑھ کر عادت بگڑ گئی ہے۔ ایک آنہ خرچ کر کے اخبار خریدا۔ اور لگے باہر کے ملکوں کی خبروں پر رائے زنی کرنے۔ کبھی کہا۔ دیکھو تو اس مسولینی کو خواہ مخواہ حبش پر چڑھ دوڑا۔ اور ذرا حبش کو بھی دیکھنا۔ کیا پدی کیا پدی کا شوربہ۔ اٹلی سے لڑنے کو خم ٹھوک کر کھڑا ہو گیا۔ اور یہ نہ سمجھا کہ بھائی تیرے پاس توپیں نہیں۔ ہوائی جہاز نہیں۔ زہریلی

گیس نہیں۔ بم نہیں۔ اور جھوٹ بولنے والے اخبارات نہیں۔ تو کیا اٹلی سے لڑے گا؟
اب اخبار ہے اور یہ اخبار پڑھنے والے ہیں۔ اپنے سب کام چھوڑ کر اٹلی اور حبش ہی کے مسئلہ پر دماغ آدھا کئے ڈالتے ہیں

یہی صورت اس وقت مجھے درپیش ہے۔ کہ پوچھتے ہیں۔ بتاؤ میاں کیا چاہتا ہے؟ لو سنو! بتاتا ہوں کہ میاں یہ چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا اُس کی بیوی کے معاملہ میں دخل نہ دے وہ جانے اور اُس کی بیوی۔ دوسروں کو کیا حق ہے کہ اُس کی مرضی اور خواہش کو معلوم کرنے کے لئے دخل در معقولات کریں۔

میاں اگر شاردا ایکٹ جاری ہونے سے پہلے میاں ہو گیا تھا تو اُس وقت اس کی عمر پرانے رواج کی بموجب دس سال کی ہے۔ کیونکہ شادی کے وقت وہ سات برس کا تھا۔ اور اُس کی بیوی چودہ برس کی تھی۔ اب بیوی سترہ سال کی ہے اور وہ اپنے میاں کا دھیان کر کے پیارے صاحب کا گیت ریکارڈ بجا کر سنتی ہے۔

سیّاں مورا بالا ہے ری!

اور میاں باجہ کی مشین بچوں کی طرح غور سے سُن رہا ہے۔ بیوی گیت سن سن کر میاں کو حسرت سے دیکھ رہی ہے۔ اور میاں بیوی کی نظروں سے بے خبر باجہ اور گانے میں محو ہے اور بیوی سے بس یہ چاہتا ہے کہ وہ تیری میری جورو والا ریکارڈ اور بجا دے اور بیوی سے ٹھنک ٹھنک کر کہہ رہا ہے کہ ہم تو جورو کا گیت اور سنیں گے۔ اور بیوی مسکرا کر کہتی ہے۔ اچھا ضد نہ کرو جورو کا گیت بھی سنا دوں گی۔

ایک میاں عمر ساٹھ سال اپنی دس سالہ بیوی سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہندو دھرم شاستر کے حکم اور ہندوستان کے رواج کی موافق پتی برتا کا برتاؤ کرے اور ایک انگریزی پڑھی بیوی کی طرح آزاد خیال نہ بن جائے۔

اور اگر میاں کوئی مولوی صاحب ہیں جو چار بیویاں کرنی فرض جانتے ہیں۔ تو وہ بس اپنی

بیوی سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ کسی سوکن پر مہربان ہونے کا میاں کو طعنہ نہ دے۔ اور یہ نہ کہے کہ تم باہر لوگوں کو تو یہ وعظ سناتے ہو کہ مسلمان کو بیوی کے ساتھ انصاف کرنا چاہئیے۔ اگر کسی کے کئی بیویاں ہوں تو وہ سب کو ایک سا کھانا اور ایک سا کپڑہ دیا کرے یہاں تک کہ اگر ایک بیوی کو لال گیہوں کی روٹی دے تو دوسری کو بھی لال کی دے۔ سفید کی نہ دے ورنہ بے انصافی ہو جائے گی۔ مگر تم اپنے گھر میں اِس انصاف کو بھول جاتے ہو۔ انوری کو چمپا کلی بنوا دی دلدار بیگم کو شال لا دی۔ شرفا کے تے بازار سے امرتیاں لائے۔ اور مجھے آج تک تانبہ کے تار کا ایک چھلہ تک نہ لا کر دیا۔ چار برس سے لحاف تک نہ بنوایا۔ بیس دن ہوتے میں نے گھر میں گوشت کی صورت تک نہ دیکھی۔

اور اگر میاں بی۔ اے پاس ہیں تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ بیوی دن میں چار دفعہ نہائے اور سات دفعہ کپڑے بدلے۔ چہرہ پر پوڈر لگائے۔ ہونٹوں پر لالی ملے اور میاں کے ساتھ سینما دیکھنے جائے۔ دعوتوں اور پارٹیوں میں شریک ہو۔ گھر میں کوئی مہمان آجائے تو اس کے سامنے آکر مسکرائے۔ اور گردن کو ہلا کر دانت دکھائے۔ اور ہلو کہہ کر مصافحہ کے لئے لپکے۔ اور چائے بنانے بیٹھے تو مہمان سے پلیز کہہ کر پوچھے شوگر کتنا مانگتا ہے اور مِلک کتنا؟ اسٹرانگ ٹی یا ہلکا دالا؟

اور جب میاں کوئی چیز بیوی کے لئے گھر میں لائے تو بیوی بُوٹی فُل بُوٹی فُل کہہ کر اس کو چومے اور بیوٹی فل بیوٹی فل کم از کم چالیس یا اکتالیس دفعہ کہے۔

بی اے پاس میاں ہرگز نہیں چاہتا کہ جب میاں گھر میں آئے تو بیوی صورت دیکھتے ہی دور سے کاٹ کھانے کو دوڑے۔ اور کہے۔ گھر میں تیل نہیں ہے کہ چراغ جلاؤں نہ آٹا ہے کہ روٹی پکاؤں۔ نہ لکڑیاں جن سے چولھا گرم ہو۔ باہر میاں ہفت ہزاری۔ گھر میں جورو فاقوں کی ماری۔ میری تو قسمت پھوٹ گئی جو اس دلدر گھر میں اماں باوا نے جھونک دیا۔ خدا غارت کرے بی سلامت کو جنھوں نے مجھے کٹنی بن کر اس دوزخ میں ڈلوا دیا کسی دن

بھی دو گھڑی کا سکھ اس گھر میں نصیب نہ ہوا۔ آدھی آدھی رات کو گھر میں آتے ہیں۔ یہ موا بائسکوپ خبر نہیں کس موذی نے نکالا ہے جب سنو یہی سنو کہ آج تیسرے والے بائیسکوپ میں گئے ہیں۔ آج مچھلی والوں کے بائیسکوپ کے سامنے کھڑے ٹہل رہے تھے۔ کل پھولڑہ کے بائیسکوپ کے چکر کاٹ رہے تھے۔ دنیا مری چلی جا رہی ہے مگر مجھ کم بخت سے موت بھی کترا کر چلی جاتی ہے۔ میں تو کچھ کھا کر سو جاؤں جب اس دوزخ سے چھٹکارا ملے گا۔

اور ایسے میاں بھی اس ملک میں ہوتے ہیں جو بیوی سے یہ چاہتے ہیں کہ بیوی میری دولت سے عیش و آرام کرے۔ وہ باورچن نہیں ہے جو ہر وقت باورچی خانہ میں گھسی رہے۔ درزن نہیں ہے جو رات دن بیٹھی کپڑے سیا کرے۔ ماما نہیں ہے جو بچوں کو پالا کرے۔

جوان میاں چاہتا ہے کہ بیوی کے بچے نہ ہوں۔ اور ادھیڑ عمر والا میاں چاہتا ہے کہ بیوی سال میں چار بچے جنا کرے۔ اور بڈھا میاں چاہتا ہے کہ جب میں گھر میں آؤں اور کوئی ہمسائی بیوی کے پاس بیٹھی ہوں تو بیوی جلدی سے کہے۔ ذرا باہر ہی ٹھہرنا اندر ہمسائی بیٹھی ہیں۔ اور جب نکاح کے بعد میں اپنی سسرال میں جاؤں تو عورتیں کہیں "لو! ذرا پردہ کر لینا لڑکا آتا ہے۔ جب عورتیں مجھے لڑکا کہیں تو مجھے اپنا بچپن یاد آجائے۔ اور میرے اندر چلوؤں خون بڑھ جائے۔ کیونکہ سوائے آج کے دن کے اور سوائے سسرال کے اور کہیں اس بڑھاپے میں مجھے لڑکا کہنے والا میسر نہ آئے گا۔

خیر یہ تو ہنسی کی باتیں تھیں۔ اب پوچھنے والا کو میں وہ جواب دیتا ہوں جس کی اس کو تلاش ہے۔

میاں یہ چاہتا ہے کہ بیوی ہم خیال ہو عقل والی ہو۔ لکھنا پڑھنا جانتی ہو۔ خانہ داری کے حساب سے واقف ہو۔ کھانا پکانا اور پکوانا آتا ہو۔ صاف رہنے کی عادت ہو۔ اپنے لباس اور گھر کے سامان کو صاف رکھے۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ نہ ہو۔ صبح اٹھ کر کنگھی کر لیا کرے۔ پان کھاتی ہو تو پیکدان میں پیک تھوکے۔ گھر کے فرش اور دیواروں کو اُگال دان نہ بنائے۔ میاں

چاہتا ہے کہ بیوی فضول اور بے کار قیمتی کپڑے اور قیمتی زیور جمع نہ کرے۔ بلکہ شادی بیاہ مہمانی اور عید بقر عید کے خاص خاص موقعوں کے لئے دو چار چیزیں سلیقہ سے گھر میں رکھ چھوڑے۔ اور اُن کو ہر موسم میں دھوپ دے۔ اور کپڑوں کو داغ دھبہ سے بچائے۔ اور زیور جڑاؤ نہ ہو۔ بلکہ سونے کا ہو۔ اور پرانی طرز کا ہو۔ کیونکہ نئے فیشن کے زیور میں لاگت آئے سو روپے کی۔ اور مال ہو پچیس روپے کا۔ پرانے زمانہ کے زیور سو روپے کے خرید و تو ننانوے روپے کے ہمیشہ جب چاہو بیچ ڈالو۔ اور سونے کا بھاؤ بڑھ جائے تو سو کے ڈیڑھ سو بن جائیں۔

میاں چاہتا ہے۔ بیوی ایسی ہو جس کو نوکروں سے کام لینا آتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ خود کچھ کام نہ کرے سارا کام نوکروں پر ڈال دے۔ کیونکہ ہندوستان کا کوئی نوکر ہمدردی سے کام نہیں کرتا۔ جب تک کہ گھر کے مالک اُن کے سر پر کوچوان کی طرح چابک لئے نہ بیٹھے رہیں۔ اور اُن سے کام نہ لیں۔ میاں چاہتا ہے۔ بیوی آمدنی سے خرچ کو نہ بڑھائے۔ پچاس کی آمدنی ہو تو ۴۵ خرچ کرے۔ کپڑے درزیوں سے نہ سلوائے۔ خود سیئے یا ایسی نگرانی رکھے کہ درزی کپڑا نہ چرا سکے۔

میاں چاہتا ہے۔ بیوی باورچی خانہ کی نگرانی کر سکتی ہو۔ اور کرتی ہو۔ ماما اور پکانے والوں پر سارا کام نہ چھوڑ دے۔ میاں چاہتا ہے کہ بیوی کے پاس گھر کے تمام اسباب کی فہرست موجود ہو۔ اور وہ بے ضرورت چیزیں نہ خریدے۔ میاں چاہتا ہے۔ بیوی پردہ کی پابندی کے ساتھ خود بازار جا کر گھر کی ضرورت کا سامان خریدے۔ اور جب ضرورت پڑے تو بازار جائے بازار میں جا کر نئی نئی ضرورتیں پیدا نہ کرے۔ میاں چاہتا ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے قرابت داروں اور دوستوں کا ایسا ہی خیال رکھے۔ جیسے میاں رکھتا ہے۔ اور اُن کے درجوں کا فرق اچھی طرح سمجھ لے۔ اور اُن کی خاطر مدارات کا خیال رکھے۔ لیکن فقط شیریں کلامی اور اچھے برتاؤ تک محدود رہے۔ کھلانے پلانے اور دینے لینے کے خرچ نہ بڑھائے۔

میاں چاہتا ہے۔ بیوی ایسی ہو کہ گھر کی ضرورتوں کا سامان خریدنے سے پہلے یہ سوچ لیا کرے۔ کہ چیز اچھی ہو اور زیادہ قیمتی نہ ہو۔ اور یہ بھی کہ گھر میں اُس چیز کے رکھنے کی جگہ بھی ہو۔

مثلاً کسی کا گھر بہت چھوٹا ہے اور بیوی نے چار پلنگ اور چھ کرسیاں اور دو میزیں خریدیں اور یہ نہ سوچا کہ اِن کو رکھوں گی کہاں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ چیزیں بارش اور دھوپ میں باہر پڑی رہیں گی۔ اور خراب ہو جائیں گی۔

میاں چاہتا ہے۔ بیوی سویرے اُٹھ کر اپنے گھر کی ہر چیز کو دیکھ لیا کرے۔ تاکہ اگر کوئی چیز بے سلیقہ رکھی ہو اور خراب ہو رہی ہو تو وہ ٹھیک ہو جائے۔

میاں چاہتا ہے۔ بیوی اپنے شوہر کی کتابوں۔ کپڑوں اور ضرورت کے سامان کو ایسے سلیقہ سے رکھے۔ کہ ہر چیز قرینہ سے اور صاف ستھری رہے۔ اور جب میاں کوئی چیز مانگے تو تلاش کرنے کا غل شور برپا نہ ہو۔ اور میاں یہ بھی چاہتا ہے کہ بیوی ہر کام کا ایک وقت مقرر کرلے۔ نہ ہر وقت باورچی خانہ میں گھسی رہے۔ نہ ہر وقت کپڑے سیا کرے۔ نہ ہر وقت بچوں میں مصروف رہے۔ بلکہ جب میاں گھر میں آئے تو بیوی اُس کے پاس بیٹھے۔ اُس سے بات چیت کرے۔ ہنسے بولے اور گھر کی ضرورتوں سے اُس کو آگاہ کرے۔ اور اُس سے باہر کے حالات پوچھے۔ اور میاں اپنے حالات سنائے تو بیوی اُس کو اچھے مشورے دے سکے۔ اور پریشانی کے وقت میاں کی ہمت بڑھائے۔ اور کہے کہ گھبرانے کی کچھ بات نہیں۔ دنیا اور زندگی اسی کا نام ہے۔ یہاں مشکلیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ مردانگی سے کام لو۔ ہر مشکل کو خدا آسان کر دیتا ہے اگر آدمی مشکلات کا مقابلہ سمجھ اور دور اندیشی سے آخر تک کرتا رہے۔

میاں چاہتا ہے۔ بیوی قرض نہ لیا کرے نہ دیا کرے۔ میاں چاہتا ہے۔ بیوی اپنے میکہ والوں کی دعوتیں زیادہ نہ کیا کرے۔ اور گھڑی گھڑی میکہ جانے کے خیال میں نہ رہے۔

میاں چاہتا ہے کہ بیوی اپنے شوہر کی محرم راز ہو۔ میاں کی ہر بات کی پردہ پوشی کرے اور میاں کی عزت کو اپنی عزت اور میاں کی خوشی کو اپنی خوشی اور میاں کے آرام کو اپنا آرام خیال کرے

جس بیوی میں اتنی خوبیاں موجود ہوں پھر بھی اُس کا شوہر اُس کی قدر نہ کرے تو بیوی چاہتی ہے کہ ایسے شوہر پر خدا کی مار ہو۔ اور وہ جتنی جلدی دنیا سے رخصت ہو اتنا ہی اچھا ہے۔

جو میاں یہ چاہتا ہے کہ بیوی درزن بنی رہے۔ باورچن بنی رہے۔ اور ہر وقت ہر کام میں میاں کی اطاعت کرتی رہے۔ اور میاں اپنی بیوی کی عزت خوشی آرام کی کچھ پروا نہ کرے۔ اور یہ سمجھے کہ میں آقا ہوں اور بیوی لونڈی ہے۔ میں بادشاہ ہوں اور بیوی رعیت ہے۔ میں لاٹ صاحب ہوں اور بیوی چپراسن ہے۔ تو ایسا میاں خدا رسول کے حکم کو نہیں مانتا۔ اور خوش باش زندگی کو نہیں جانتا۔ اور اُس پر خدا کی لعنت برستی رہتی ہے۔ کیونکہ خدا ہر بندہ سے یہ چاہتا ہے۔ کہ وہ دوسروں کا حق ٹھیک اور انصاف کے ساتھ ادا کرے۔

خلاصہ یہ ہے۔ کہ میاں چاہتا ہے۔ کہ بیوی اُس کی شریک زندگی ہو۔ رفیق ہو مونس ہو۔ اور ایسا نہ ہو کہ بیوی میاں کے سر پر آسیب بن کر سوار رہے۔ اور بھوتنی چڑیل کی طرح میاں کی زندگی کو دوزخ کی زندگی بنا دے۔ ایسی بیوی کو میاں وبالِ جان سمجھتا ہے۔

روحانی تاثیرات کا عقلی

مناظرہ

جو ۵ ستمبر ۱۹۳۶ء کی شام کو حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب اور نواب خواجہ محمد شفیع صاحب کے درمیان دہلی ریڈیو میں نشر ہوا

نواب صاحب۔ آداب عرض کرتا ہوں۔ آج دلی ریڈیو نے عرصہ کے بعد آپ سے ملاقات کا موقع دیا۔

خواجہ صاحب۔ تسلیمات عرض ہے۔ جی ہاں آپ کی ملاقات گزشتہ ملاقاتوں سے دلچسپ بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ اگرچہ یہاں آپ کے اور میرے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے۔ لیکن کم از کم ایک کروڑ عورت مرد ہم دونوں کی باتیں سننے کو یہاں موجود ہیں۔ روحانی لوگ اسی کو کہا کرتے ہیں کہ ہم موجود ہیں اور ہم موجود نہیں ہیں۔ اور شاعر اس کو کہہ مکرنی کہتے ہیں۔

نواب صاحب:۔ میں انہی روحانی حضرات کے ایک دعوے کی نسبت آج آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا تعویذ گنڈے سے بیماریاں اسی طرح دور ہو سکتی ہیں جس طرح حکیموں اور ڈاکٹروں کے علاج سے دور ہو جاتی ہیں؟

خواجہ صاحب:۔ بے شک روحانی کمالات میں یہ طاقت ہے کہ وہ بیماریوں کو دور کر سکتے ہیں۔ اور انسان کی سب ضروریات اور مرادوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ مگر روحانی لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جیسے حکیم ڈاکٹر کی دوا میں خدا اثر دیتا ہے۔ ایسے ہی روحانی لوگوں کے تعویذ گنڈہ کا اثر بھی خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔

نواب صاحب:۔ ہم ڈاکٹری دواؤں کا اثر ہر کس و ناکس کو آنکھوں سے دکھا سکتے ہیں۔ کیا روحانی لوگ بھی تعویذ گنڈہ کی تاثیر اسی طرح دکھا سکتے ہیں؟

خواجہ صاحب:۔ بھائی جان آنکھوں سے وہ چیز دیکھی جا سکتی ہے جو مادی ہو۔ روحانی چیزیں اور کیفیات اور ذائقے آنکھوں کو نظر نہیں آیا کرتے۔ کیا کوئی بھوک کو دکھا سکتا ہے؟ پیاس کو

دکھا سکتا ہے؟ اور تلخی اور مٹھاس کے مزہ کو دکھا سکتا ہے؟ شاعر کو تو معشوق کی مادی کمر بھی نظر نہیں آتی۔ اور مادی آنکھ ساری دنیا کو دیکھتی ہے۔ مگر خود اپنے اُس چہرہ کو نہیں دیکھ سکتی جہاں وہ ہوتی ہے۔ اسی طرح روحانی تاثیرات کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ وہ مادی چیزوں کی طرح نظر بھی آئیں۔

نواب صاحب:۔ اِس سوال سے میرا مدعا یہ ہے کہ مثلاً کسی مرض کے جراثیم پر ہم دوا ڈال کر مار دیتے ہیں اور بیماری جاتی رہتی ہے۔ اسی طرح کیا تعویذ گنڈہ بھی بیماری کے جراثیم کو فنا کر سکتا ہے؟

خواجہ صاحب:۔ آپ کے اِس سوال کا جواب حالات پر منحصر ہے۔ اگر کسی آدمی کی بیماری جراثیم کی وجہ سے ہو گی تو دوا جراثیم کو مار کر اچھا کر دے گی لیکن اگر بیماری خیالات کی ہوئی تو اُس کو کوئی دوا مفید نہیں ہو گی اور تعویذ گنڈہ اور روحانی طاقتوں کی تاثیرات بعض امراض میں ایسی ہی نظر آ سکتی ہیں جیسی کہ آپ چاہتے ہیں۔

نواب صاحب:۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تعویذ گنڈہ اور روحانی چیزوں کی تاثیریں عقل میں آنے کے قابل ہیں؟ اور کیا سائنس کی ترقیوں کے اِس زمانہ میں ایسی خلافِ عقل چیزوں کا ماننا ہندوستان کی عقلی نیک نامی کے لئے مناسب ہے؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ سائنس نے اِن سب خلافِ عقل باتوں کو نقشِ باطل کی طرح مٹا دیا ہے۔ اور تعویذ گنڈہ توہمات محض ہیں۔ اور اِن کے ماننے کے سبب ہندوستان ساری ترقی یافتہ دنیا کی نظروں میں ہدفِ ملامت بنا ہوا ہے۔

خواجہ صاحب:۔ آپ کے سوال کے پہلے حصہ کا جواب یہ ہے۔ کہ روحانی چیزوں اور تعویذ گنڈہ کی تاثیرات اُنہی کی عقل میں آ سکتی ہیں جو روحانیت کا علم رکھتے ہیں۔ کیونکہ آپ کے نئے سائنس کی ایجادیں ریل، تار، ٹیلی فون، گراموفون، ریڈیو، سینما بھی اُن کی عقل میں کہاں آ سکتے ہیں جو اُن کا علم نہیں رکھتے۔

اور دوسرے حصہ کا یہ جواب ہے۔ کہ ہندوستان ہزاروں برس سے روحانی ملک مانا جاتا

ہے۔ اور باہر کی دنیا میں ہندوستان کی عزت اپنے روحانی کمالات کی وجہ سے ہے۔ لہذا ان کا ماننا بدنامی نہیں بلکہ ملک کی نیک نامی ہے۔ اور نئے سائنس کی ایجادیں روحانی کمالات کی تائید کرتی ہیں۔ تردید نہیں کرتیں۔ کیونکہ سائنس بھی انسانی دماغ کا کرشمہ ہے۔ اور روحانی کمالات کا تعلق بھی انسانی دماغ سے ہے۔

نواب صاحب:- میں اس کو کیونکر مان لوں کہ خلاف عقل باتوں سے ہندوستان کی نیک نامی ہوتی ہے۔ یورپ میں روزانہ ہندوستان کی جہالت کی داستانیں شائع کی جاتی ہیں۔ اور اُن کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور ابھی تک ہم اسی خیال میں ہیں کہ یہ جھاڑ پھونک ہماری عظمت قائم رکھنے میں معاون ہے۔ دنیا ترقی کے آسمان پر پہنچی جاتی ہے اور ہم وہی داستان پارینہ لئے بیٹھے ہیں افسوس ہے۔ ع یاران تیز گام نے محمل کو جالیا ؎ ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے۔

خواجہ صاحب:- بھائی جان۔ غلط اور جہالت کی جھوٹی جھاڑ پھونک کے میں بھی خلاف ہوں مگر روحانی کمالات اور تعویذ گنڈہ اور دعا ایسی علمی اور عقلی چیزیں ہیں کہ اگر کوئی ان کا مذاق اُڑائے تو اُس کی حالت خود مذاق اڑانے کے قابل ہے۔ روحانی لوگ کب کہتے ہیں۔ کہ آپ ترقی کے آسمان پر نہ اڑیئے۔ نہ روحانیت دنیا کی ترقی کے راستہ کا روڑا ہے۔ ہندوستانی لوگ تیز رفتار قوموں کے ساتھ ترقی کے میدان میں روحانی باتوں کی رکاوٹ کے سبب نہ دوڑ سکے۔ بلکہ اس کا سبب بے علمی، بے شوقی، کاہلی اور آرام طلبی ہے۔ اور یہ عیب روحانیت نے پیدا نہیں کئے جسمانیت نے پیدا کئے ہیں۔

نواب صاحب:- کیا تعویذ گنڈہ اور جھاڑ پھونک ہندوستان کے جاہلوں کی باتیں نہیں ہیں میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ نہ پہلے کوئی صاحب عقل ان خلاف عقل توہمات کو مانتا تھا۔ نہ آج کوئی مانتا ہے۔ صرف کم علم اور کوتاہ بیں اس گورکھ دھندہ میں پھنسے ہوتے ہیں۔

خواجہ صاحب:- جی نہیں یہ بات نہیں بلکہ گزشتہ زمانہ کے بہت سے اہل علم اور اہل عقل بھی روحانی باتوں کو مانتے تھے۔ یہاں تک کہ سر سید احمد خاں صاحب بھی مانتے تھے۔ اور مولانا حالی بھی مانتے تھے۔

اور آپ کے دادا نواب عبدالرحیم خاں صاحب بھی مانتے تھے۔ اور آپ کے نانا نواب محمد کرم اللہ خاں صاحب بھی مانتے تھے۔ اور میں اُن کے واقعات سنا سکتا ہوں۔

نواب صاحب:۔ مانا کہ سرسید تعویذ گنڈہ کو مانتے تھے۔ بھوت پریت کے بھی قائل تھے چھل پیری پر بھی اُن کا ایمان تھا۔ تاہم اس کے یہ معنے نہیں کہ یہ تمام چیزیں عقلی دلائل سے ثابت کی جاسکتی ہیں۔ سرسید مانتے تھے مانا کریں۔ ہم تو اُس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک کوئی منوا نہ دے۔ اگر سرسید نے کوئی کتاب چڑیل اور چھل پیری کی حمایت میں لکھی ہو تو پیش کیجئے۔ بندہ اُس کو پڑھے گا۔ ورنہ اُن کے اعتقادات کو بغیر سمجھے بوجھے ماننے کے لئے تو یہ ناچیز تیار نہیں ہے۔

ہم معتقد دعوئے باطل نہیں ہوتے ؛ پہلو میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

خواجہ صاحب:۔ میں نے یہ نہیں کہا۔ کہ سرسید اُن جاہلانہ باتوں کو بھی مانتے تھے۔ جن کا نام آپ لے رہے ہیں۔ کیونکہ اُن کی نسبت تو یہ مشہور تھا کہ وہ فرشتوں اور جنات کے وجود کو بھی نہیں مانتے پھر بھوتوں وغیرہ کو کیوں کر مانتے۔ میں تو اُن کے اور مولانا حالی اور آپ کے دادا صاحب اور نانا صاحب کے ایسے واقعات سنانے چاہتا ہوں۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ روحانی کمالات کو مانتے تھے۔ ان واقعات کے سننے سے آپ کو اور سب سننے والوں کو نتیجہ نکالنے میں آسانی ہو گی۔

نواب صاحب:۔ گویا آپ میرے اور سننے والوں کے جذبات پر ایسا اثر ڈالنا چاہتے ہیں جو ہم سب کو عقل سے ہٹا کر جذبات کی طرف متوجہ کر دے۔ اور ہم عقلی دلائل کا مطالبہ ترک کر دیں۔

خواجہ صاحب:۔ جذبات پر تو ساری دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے۔ میں جذبات کو عقل کا دشمن خیال نہیں کرتا۔ یہ واقعات بیان کرنے سے غرض یہ ہے کہ ہندوستان میں علم و عقل کی بنیاد رکھنے والے بھی روحانی قوتوں کو مانتے تھے۔

نواب صاحب:۔ سنائیے میں سن لوں گا۔ مگر پھر میں بھی کوئی قصہ سناؤں گا۔ تاکہ واقعات سے واقعات کی تردید ہو جائے۔

خواجہ صاحب:۔ میں نے نواب مصلح الدین صاحب سے سنا ہے (جو سرسید کے پوتے سر راس مسعود

کے حقیقی ماموں ہیں۔ اور دہلی میں موجود ہیں) کہ سرسید کے والد سید متقی صاحب حضرت شاہ غلام علی
صاحب کے مرید تھے۔ اور جب سرسید پیدا ہوئے تو اُن کے والد نے مراقبہ کر کے سرسید کے
مستقبل کو دیکھا۔ اُن کو مراقبہ سے معلوم ہوا۔ کہ یہ لڑکا انگریزی لباس اور انگریزی خیال اختیار
کرے گا۔ یہ حالت دیکھ کر سید متقی اپنے پیر کے پاس گئے۔ اور اپنے مراقبہ کا ذکر کیا۔ تب اُن
کے پیر خود سید متقی صاحب کے گھر میں آئے اور سرسید کے کان میں اذان کہی اور مراقبہ کر کے
بتایا۔ کہ یہ لڑکا مسلمانوں کی بہت مدد کرے گا۔ اور پکا مسلمان ہوگا اور اُس کا خاتمہ بالخیر ہوگا۔
اس کا انگریزی لباس اور انگریزی خیالات ہندوستان کو فائدہ پہنچائیں گے۔

یہ واقعہ شاہ غلام علی صاحب کے ایک مرید نے جو مراقبہ مذکور کے وقت موجود تھا سرسید
کو علی گڑھ میں نواب محسن الملک وغیرہ کی موجودگی میں سنایا تو سرسید رونے لگے اور روتے
روتے بے ہوش ہو گئے اور سرسید نے حضرت شاہ غلام علی صاحب کے روحانی کمالات اور
مراقبہ کی طاقت کو سب کے سامنے تسلیم کیا۔ یہ واقعہ اُن کی وفات کے قریب کا ہے۔
جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرسید مراقبہ اور روحانی قوتوں کو مانتے تھے۔ اور آخری وقت تک
مانتے رہے۔ آپ کے مکان کے قریب نواب دوجانہ کی مسجد کے سامنے کاؤس جی پارسی
نے ناٹک کے تماشہ کا منڈوا بنایا تھا۔ دلّی کے مسلمانوں نے آپ کے نانا نواب محمد کرم اللہ
صاحب کو اپنی ناراضی کا محضر دیا۔ نواب صاحب نے وہ ڈپٹی کمشنر صاحب دہلی کو بھیجدیا۔
ڈپٹی کمشنر صاحب نے مسلمانوں کے خلاف فیصلہ کیا۔ اور آپ کے نانا صاحب کو امن و
انتظام کا ذمہ دار بنا دیا۔ جس سے دہلی کے مسلمانوں میں بہت جوش پھیل گیا۔ اور پھر تین
چار دن تماشہ ہوتا رہا۔ اِس کے بعد ایک فقیر آپ کے نانا کے پاس آیا۔ اور اُس نے زمین
سے خاک کی مٹھی بھر کر اٹھالی اور اُس پر کچھ پڑھ کر دم کیا۔ اور خاک ناٹک گھر کی طرف
پھینک دی۔ اُس کا اثر یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن کاؤس جی خود بخود اپنے تماشہ گھر کو یہاں
سے اٹھا کر لے گئے۔ یہ قصہ آپ کے دادا نواب عبدالرحیم خاں صاحب نے مجھ سے بیان

کیا تھا۔ تو بتائیے کہ خاک کی چٹکی نے یہ کیا اثر کیا؟ اور فقیر کے دم کرنے میں کیسی عجیب تاثیر تھی؟
نواب صاحب:۔ آفت تو یہی ہے کہ ہمارا دماغ ہم کو غلط طرف لئے جاتا ہے۔ جب سوجھتی ہے اندھی ہی سوجھتی ہے۔ معاملہ یہ تھا کہ جس مقام پر اُس نے منڈوا بنایا تھا وہ جگہ مسلمانوں کی آبادی کے بیچ میں واقع ہے۔ سمجھدار آدمی تھا۔ ڈرا کہ رات برات کو کسی نے آگ لگادی تو کچا ٹھاٹھ ہے ایک پردہ بھی سلامت نہیں بچے گا۔ بے چارہ چلا گیا۔ یاروں نے فقیر صاحب کے سر سہرا باندھا۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر کہیں اس تماشہ میں آگ لگ جاتی تو یہ فقیر صاحب ہی ذمہ دار ٹھہرائے جاتے کہ کمال کا بزرگ تھا۔ دیکھا آگ لگادی۔ میاں بڑے بڑے کمال پڑے ہوئے ہیں۔ اور سرسید کے قصہ سے تعویذ گنڈہ کا ثبوت کہاں نکلا۔ آپ نے تو مراقبہ کی ایک نئی خلاف عقل بات سنا دی۔

خواجہ صاحب:۔ مولانا حالی آپ کے نانا کے ہاں دہلی میں آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ اور میں اُن سے ملنے جایا کرتا تھا۔ ایک دن مولانا حالی نے مجھ سے فرمایا۔ کہ میرے نواسہ کو مرگی ہے۔ نہ ڈاکٹری علاج سے فائدہ ہوتا ہے نہ یونانی علاج سے۔ اب کوئی درویش بتاؤ جو دعا تعویذ کا علاج کرے۔ میں نے ضلع راولپنڈی کے ایک درویش کا ذکر کیا کہ وہ سورۂ مزمل کے عامل ہیں۔ اور صرف یَا اَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ پڑھ کر بیماروں کو اچھا کر دیتے ہیں۔ مولانا حالی کے لڑکے مولانا سجاد حسین صاحب راولپنڈی میں انسپکٹر تعلیمات تھے۔ مولانا حالی نے اُن کو لکھا۔ اور مولانا سجاد حسین صاحب اُن عامل صاحب سے ملے۔ عامل صاحب نے پانی پت کی طرف رُخ کرکے انگلی کا اشارہ کیا۔ اور یا ایھا المزمل ایک دفعہ پڑھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا حالی کے نواسہ کی مرگی جاتی رہی۔ اور پھر کبھی دورہ نہ ہوا۔ کیا یہ روحانی کمال کی تاثیر نہ تھی؟

نواب صاحب:۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایسا ہوا ہوگا۔ مگر میں تو عقلی دلیلیں چاہتا ہوں۔ اب ذرا ان واقعات کی تردید میں میرا بھی ایک واقعہ سن لیجئے۔

میرے جاننے والے ایک صاحب تھے۔ اُن کا پہلا بچہ (لڑکا) گزر گیا۔ دوسرا لڑکا جب

پیدا ہوا تو اُس کے کان میں بندہ ڈالنے کی تجویز پیش کی گئی۔ تو کان چھیدنے کے واسطے چھ
خصمی کی سوئی منگائی گئی تھی۔ اور اب بھی آپ کسی پرانی بڑھیا سے پوچھ لیجئے۔ یہ عمل یوں ہی کیا
جاتا ہے۔ اور یہ بندہ شادی کے بعد زوجہ محترمہ سینہ پر پاؤں رکھ کر اتارتی ہیں۔ علاوہ ازیں
میرے کنبہ میں ایک بڑی بی تھیں۔ وہ بچپن میں بڑی اللہ آمین پیر سلامی کی تھیں۔ جب اُن
کے بڑے نہ رہے تو وہ بچاری خود اپنی دیکھ ریکھ کرتی رہتی تھیں۔ اتفاق سے ایک مرتبہ بیمار ہوئیں
روزانہ ایک بکرے کا خون ہوتا تھا۔ نتیجہ یہاں تک پہنچا کہ جب بکرے کی بھینٹ کافی نہ سمجھی گئی
تو ایک بزرگ نے فرمایا کہ بھینسا ذبح کرو۔ ہم تک اطلاع ہوئی۔ میرا بچپن تھا۔ ہم بھی دیکھنے
گئے۔ اور تماشہ یہی ہوا۔ ملاحظہ کیجئے۔ کہ رات کو ایک کھونٹا انگنائی میں گاڑا گیا۔ اور اُس سے
بھینسے کو پاچھولاں کیا۔ اور اُس کا ایک پاؤں ان بڑی بی کی چارپائی کے پایہ سے باندھا گیا۔
رات کے بارہ بجے ہوں گے کہ شور وغل کی آواز بلند ہوئی۔ میری بھی آنکھ کھلی تو گھر کے ایک
کونہ میں سب جمع تھے۔ اور چیخ پکار مچ رہی تھی۔ ماجرا یہ تھا کہ بھینسا گھبرا گیا۔ کہ میری دُم میں
یہ کھٹکھٹا کیسا بندھا ہے۔ اور وہ کھونٹا تڑا کر بھاگا۔ اُن کی چارپائی ساتھ ساتھ۔ انھوں نے
غل مچانا شروع کیا۔ بڑی مشکل سے رسّی کاٹی گئی۔ اور وہ بڑی بی اس عمل سے اچھی تو ہوئیں
نہیں اور موئی بے شک ہو گئیں۔ تو خیال کیجئے کہ جب روزانہ ایسے ہزاروں واقعات پیش آئیں
تو میں کیونکر مان لوں کہ ان عملیات میں کوئی اثر ہے۔

خواجہ صاحب:۔ آپ نے بہت دلچسپ قصّہ سنایا جس کی زبان بھی بڑی مزہ دار تھی کیوں
نہ ہو دِلّی کی شستہ زبان تو آپ کے گھروں سے نکلی تھی۔ مگر اس قصہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ روحانی
علاج کا اس سے کچھ بھی تعلق نہ تھا کسی جاہل عامل نے یہ علاج بتایا ہوگا۔ جو قطعی غلط تھا کیونکہ
اصلی عامل ترک حیوانات کے پابند ہوتے ہیں۔ اور کسی جانور کی بھی جان لینا جائز نہیں سمجھتے
پس بکرے کاٹنے اور بھینسا کاٹنا روحانی علم والوں کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ اور اس واقعہ
سے روحانی علاج کی تردید ثابت نہیں ہوتی۔

نواب صاحب:۔ مانا کہ وہ بکروں کا خون کسی جاہل کی گردن پر ہوا۔ اور بھینسے کی ہتھیا بھی اُسی کے سر پہ رہی۔ پھر یہ عرض ہے کہ اب کوئی عامل صاحب کچھ کرکے دکھادیں تو ہم جانیں۔

خواجہ صاحب:۔ بے شک اب بھی ایسے کامل عامل موجود ہیں۔ جو آپ کو یہ کمالات دکھا سکتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ نئے سائنس والوں نے انسان کے وجود کے اندر جو بے شمار قوتیں ہیں اُن کی سائینٹیفک تحقیقات نہیں کی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو روحانی قوت کو مان جاتے اور دعا تعویذ کا اثر بھی اُن کو عقل کے موافق معلوم ہونے لگتا۔ اور انسانی وجود کی باطنی قوتوں سے دنیا کے ہزاروں کام لیتے۔ جیسے کہ وہ نباتات، جمادات اور حیوانات اور عناصر یعنی ہوا بجلی، پانی وغیرہ سے کام لے رہے ہیں۔ ڈاکٹر موت کے علاج، بڑھاپے کے علاج اور بیماریوں کے اسباب کی تحقیقات بے شک کرتے رہتے ہیں۔ مگر اُنھوں نے بھی آنکھوں اور تصور اور خیال، اور اُن برقی اور مقناطیسی قوتوں کو معلوم کرنے کا کوئی کام نہیں کیا۔ جو انسان کے اندر خدا نے پیدا کی ہیں۔ یہ تو حکیم اور ڈاکٹر اور وید سب مانتے ہیں کہ بیماریوں کا مقابلہ کرنے کی ایک طاقت جسم کے اندر ہوتی ہے۔ جس کو طبیعت کہتے ہیں۔ اُس کو مضبوط کرنے کے لئے دوائیں دی جاتی ہیں۔ ورنہ دوائیں بیماریوں کو دور نہیں کرتیں لیکن حکیم ڈاکٹر جسم کی کہربائی اور برقی اور روحانی قوتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ حالانکہ وہی قوتیں دعاؤں اور تعویذوں اور گنڈوں اور دم کرنے میں اثر کرتی ہیں۔

نواب صاحب:۔ بارِ ثبوت مدعی پر ہوتا ہے۔ روحانی قوتوں کے آپ دعوے دار ہیں۔ آپ ثبوت بہم پہنچایئے۔ ڈاکٹر تو اِن کے وجود ہی کے قائل نہیں۔ پھر تحقیقات کس چیز کی کریں

بندہ نواز:۔ جہاں تک تصور، خیال اور خواب وغیرہ کا تعلق ہے اِس پر اتنی تحقیقات کی گئی ہے کہ ایک بہت بڑا کتب خانہ صرف ان کتابوں کا قائم کیا جاسکتا ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ بے شک اِس مقناطیسی قوت کے نہ ہم قائل ہیں نہ اِس کی ہم تحقیقات کریں۔ اِس کے آپ دعوے دار ہیں اِس کی تحقیقات کرنا یا نہ کرنا آپ کا فعل ہے۔ ہم تو صرف یہ کہتے

ہیں۔ کہ اگر کسی عامل میں مقناطیسی طاقت ہے تو وہ مجھ کو میری جگہ سے ایک انچ بھی اگر سرکا دیں تو میں ایمان لے آؤں۔ اور برخلاف اس کے ہم اپنی بجلی کے زور سے بڑے سے بڑے عامل صاحب کو گز دو گز بآسانی جنبش دیدیں گے۔ اور نہایت تیزی کے ساتھ۔ بہرکیف اگر آپ بزرگوں نے اس معاملہ میں کوئی تحقیقات کی ہو تو فرمائیے۔

خواجہ صاحب:۔ کیا شک ہے آپ کی بجلی بچارے عامل ہی کو نہیں بلکہ ہمالیہ پہاڑ کو میلوں اونچا اٹھا سکتی ہے۔ میں سائنس کی معلوم کی ہوئی قوتوں سے کب انکار کرتا ہوں۔ میرا کہنا تو یہ ہے کہ سائنس والوں نے انسانی وجود کی روحانی قوتوں کو جانا نہیں۔ اور نہ اُن کی تحقیقات کی۔ ورنہ اُن کی اور آپ کی عقل میں روحانیت کا فلسفہ آجاتا۔ اور آپ شک و شبہ میں نہ رہتے۔

روحانی علاج کرنے والوں نے اس کی ایسی ہی تحقیقات کی ہے۔ جیسے سائنس داں نئی ایجادوں کی تحقیقات کرتے رہتے ہیں۔ البتہ آج کل ایسے محقق بہت کم ہو گئے ہیں۔ اور اناڑی بازاری تعویذ گنڈوں کو بدنام کرتے پھرتے ہیں۔ اور اس سوال کا جواب کہ عاملوں کی تحقیقات عقل میں آسکتی ہے یا نہیں۔ یہ ہے کہ ریل۔ تار۔ ٹیلیفون۔ سینما۔ ریڈیو کے کمالات کی وجہ بھی ہر عقل میں کہاں آسکتی ہے؟ سوائے گنتی کے چند آدمیوں کے جو اس کے سائنس کی باریکیوں کو جانتے ہیں۔ اسی طرح دعا تعویذ اور گنڈہ وغیرہ کی تاثیرات کا فلسفہ اور سائنس بھی اُن ہی کی عقل میں آسکتا ہے۔ جن کی عقل علم کے ذریعہ اتنی بڑھی ہو جو ہر چیز کے سائنس اور فلسفہ کو سمجھ سکے۔

نواب صاحب:۔ مانا کہ ہماری ناقص عقل میں اس مقناطیسی طاقت کا فلسفہ نہ آسکے۔ تاہم اس کا مشاہدہ ہم کو کرا دیا جائے۔

خواجہ صاحب:۔ جس حد تک روحانی کمالات کا مشاہدہ ممکن ہے مشاہدہ کرایا جاسکتا ہے۔ اور یہ مشاہدہ تو ہر شخص کر رہا ہے کہ روحانی کمالات والے رحم دل ہیں۔ اور اُن میں دوسروں

کی ہمدردی ہے اور وہ خود غرضی سے پاک ہیں۔ اور سائنس والے لوہے اور بجلی اور بھاپ کے محکوم ہو گئے ہیں۔ اور محبت و ہمدردی اُن کے دل سے دور ہو گئی ہے۔ بے شک سائنس کی ایجادوں نے دنیا کو فائدہ پہنچایا ہے۔ مگر نقصان بھی پہنچایا ہے۔ روحانی لوگوں نے اگر نظر آنے والی چیزیں پیش نہیں کیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے کمالات انسان کی جسمانی نظر میں آتے کیونکہ وہ تو بہت لطیف ہوتے ہیں جسم کی مادی نگاہ اُن کو اسی طرح نہیں دیکھ سکتی جس طرح ہوا، بجلی وغیرہ کو نہیں دیکھ سکتی۔

میں اس کو مانتا ہوں کہ روحانی قوتوں کو غلط استعمال کرنے والوں نے یا اُن لوگوں نے جو روحانی کمالات نہ رکھتے تھے اور فرضی روحانی بن گئے تھے۔ ہندوستانیوں کو نقصان پہنچایا اور اب بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اور وہ نتائج بھی درست ہیں جو آپ نے پیش کئے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ دعا تعویذ اور روحانی قوتوں کی تاثیرات غلط ہیں۔ یا خلافِ عقل ہیں۔

نواب صاحب: میں یہ نہیں مانتا کہ موجودہ ایجادات کی وجہ سے زمانہ ترقی یافتہ لوہے اور بھاپ کا محکوم ہو گیا ہے۔ بندہ نواز غور کیجئے کہ اگر میں اپنے ہاتھوں سے کوئی کام لیتا ہوں تو یہ کہنا کہ میں اپنے ہاتھوں کا محکوم ہوں کس قدر غلط ہوگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے ہاتھ میرے تابعدار ہیں جب چاہتا ہوں اور جو چاہتا ہوں اُن سے کروا لیتا ہوں۔ یہی کیفیت لوہے اور بھاپ کی ہے۔ اور نہ صرف لوہا اور بھاپ بلکہ وہ قدرتی طاقتیں جو اب تک ہماری تباہی اور بربادی کا باعث ہوتی تھیں۔ آج ہمارے قابو میں آ کر ہمارے حکم پر چلتی ہیں۔ مثلاً بجلی جو اب تک ہلاکت کا دیوتا سمجھی جاتی تھی آج تمام دن ہم کو پنکھا جھلتی رہتی ہے اور تمام رات شمع لئے کھڑی رہتی ہے۔ یہ خیال کہ بھاپ، بجلی اور دیگر چیزوں کو ہم نہیں دیکھ سکتے قطعاً غلط ہے۔ موجودہ ایجاد کی مدد سے ہم ہر ایک مادی چیز کو جس سے ہم کام لے رہے ہیں دیکھ سکتے ہیں۔ اور اس کا پورا پورا طرح مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یہ کمال کہ نادیدہ چیز پر حکومت کریں صرف

عاملوں کو حاصل ہے۔ہم ایسا دعویٰ جس کو ثابت نہ کر سکیں نہیں کرتے۔ اور نہ ایسے دعوؤں کو ماننے ہی کے لئے تیار ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ اصحاب باطن نے ایسی چیزیں پیش نہ کیں جو نظر آسکیں۔یہی ہمارا بھی کہنا ہے۔کہ وہ چیزیں جن کا ہم اپنے احساسات اور عقل سے ادراک نہ کر سکیں ان کو ہم ماننے کے لئے تیار نہیں۔

خواجہ صاحب:۔اچھا میں آپ کی عقل اور ادراک کے قابل کچھ باتیں سناتا ہوں۔سنیئے جس طرح خدا نے دواؤں میں تاثیر رکھی ہے اور وہ بیماریوں کو دور کرتی ہیں۔اسی طرح خدا نے آدمی کے اندر ایسی برقی اور کہربائی اور مقناطیسی اور روحانی قوتیں بھی رکھی ہیں جو بیماریوں کو دور کر سکتی ہیں۔اور آدمی کے خیالات اور حالات کو بدل سکتی ہیں۔گویا دواؤں کا اثر بھی خدا کی طرف سے ہے اور دعاؤں کا اثر بھی خدا کی طرف سے ہے۔اور جس طرح دواؤں سے کام لینے کے لئے حکیم ڈاکٹر علم طب حاصل کرتے ہیں اور انسانی جسم کی حقیقت کو معلوم کرتے ہیں۔اسی طرح روحانی لوگ روحانی قوتوں سے کام لینے کے لئے روحانیت کا علم بھی حاصل کرتے ہیں۔اور پھر عملی تعلیم کے لئے مجاہدے کرتے ہیں۔جس سے اُن کی نگاہوں میں اور سانس میں اور ہاتھوں میں ایسی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔کہ جب وہ اِس ارادہ سے کسی کو دیکھتے ہیں کہ اُس کا خیال بدل جائے۔بُرے حالات اچھے ہو جائیں۔بیماریاں دور ہو جائیں تو عامل کی نظر اور ارادہ کی نظر نہ آسکنے والی لہریں عامل سے جُدا ہو کر معمول کے اندر چلی جاتی ہیں اور اُس کی بیماریوں کو دور کر دیتی ہیں۔اور اُس کی برائیوں کو بدل دیتی ہیں۔اور اُس کی خواہشات کو پاکیزہ بنا دیتی ہیں۔

تعویذ کا فلسفہ بھی یہی ہے۔کہ عامل کی باطنی قوتیں دل اور دماغ اور مقام روح سے عامل کے ارادہ اور تصور میں آتی ہیں۔اور پھر ہاتھوں کی انگلیوں کے ذریعہ تعویذوں کی تحریر میں جذب ہو جاتی ہیں۔اور وہ تعویذ بیماریوں کو دور کر دیتے ہیں۔اور اُن کے اثر سے انسانی

ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔
نواب صاحب:۔ تاثیر ہر چیز میں خدا ہی نے دی ہے۔ لیکن ہم جب اس تاثیر سے کام لینا چاہتے ہیں تو اُس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو کرو اسکتے ہیں یہی درخواست ہماری اصحاب باطن سے ہے۔ کہ اُس مقناطیسی طاقت کا جو اُن کی رائے میں اُن کی انگلیوں میں موجود ہے۔ ہم کو مشاہدہ کروادیں۔ ہم قائل ہو جائیں گے۔

بندہ نواز عقل اور عقیدہ میں جنم جنم کا بیر ہے۔ اِن کی لاگ ڈانٹ ضرب المثل ہے عقیدہ کے آگے عقل نہیں چلتی اور عقل کے سامنے عقیدہ کے پاؤں لڑکھڑا جاتے ہیں۔ جہاں تک عقائد کا سوال ہے میں بھی اپنے نانا ہی جیسا خوش اعتقاد یا ضعیف الاعتقاد ہوں لیکن کیا کروں عقل نہیں مانتی۔ میری رائے ناقص میں جناب نے اب تک ایک بھی عقلی دلیل ایسی پیش نہیں کی۔ جو مجھ کو یا اور کسی صاحب فہم کو یہ منوا دے کہ تعویذ گنڈہ میں اثر ہے۔
خواجہ صاحب:۔ ممکن ہے کہ آپ کو اطمینان نہوا ہو۔ لیکن مناظرہ سُننے والے صحیح فیصلہ کرسکتے ہیں۔ کہ میں نے روحانی کمالات اور تعویذ گنڈوں کی تاثیرات کا فلسفہ عقل میں آنے کے قابل بیان کیا یا نہیں کیا؟ اور اگر میں بالفرض جواب دینے میں ناکام بھی رہا تب بھی میرے ضمیر کو یہ اطمینان ہے کہ خود میری عقل نے میری دلیلوں کو مان لیا۔ اور یہی بات میرے لئے اور میرے ہم عقیدہ لوگوں کے لئے کافی ہے۔ کہ ہم روحانی کمالات کی تاثیر کو ہر وقت اور ہر جگہ دیکھتے ہیں۔ اور اِسی وجہ سے اُن کو مانتے ہیں۔

امام حسینؑ کی شہادت

خواجہ صاحب کی تقریر جو عشرہ محرم ۱۳۵۵ھ کی شام کو خود خواجہ صاحب نے دلی ریڈیو میں سنائی۔

اب ذرا دل تھام لینا۔ ایسی باتیں سُننے کا وقت آگیا۔ جو آدمیت رکھنے والے انسان کے دل کی برداشت سے بڑھ کر ہیں۔ سُننے والے اپنے اپنے تصور میں ایک خیالی تصویر میرے بیان سے بناتے جائیں تو کربلا کی اصلی حالت سامنے دکھائی دینے لگے گی۔

دس محرم کو دن کے ایک بجے تک حضرت امام حسینؑ کے بھائی اور لڑکے اور ساتھی جو سب مل جل کر ۷۲ آدمی تھے۔ اُس زمانہ کے دستور کی موافق ایک ایک کرکے میدانِ جنگ میں گئے اور بڑی بہادری سے لڑے اور مارے گئے۔ حضرت امام حسینؑ گھوڑے پر سوار کھڑے رہتے تھے۔ اور اپنے بچوں اور ساتھیوں کے قتل کے وقت مقتل میں پہنچ جاتے تھے۔ اور اُن کے ساتھی اور بچے اپنے باپ اور آقا کی گود میں سر رکھ کر جان دیتے تھے آخر جب کوئی مرد باقی نہ رہا تو حضرت امام حسینؑ عورتوں کے خیمہ میں گئے۔ عورتیں پہلے ہی سے ایک جگہ جمع تھیں۔ حضرت امام حسینؑ کی بہن زینبؑ اور بیوی شہر بانو جو شہنشاہ ایران یعنی کسریٰ کی بیٹی تھیں۔ اور حضرت کی لڑکیاں سکینہؑ وغیرہ حضرت کے چاروں طرف جمع ہوگئیں۔ اور حضرت کی بے کسی اور تنہائی کو دیکھ کر رونے لگیں۔ تو حضرت کے منجھلے لڑکے علیؑ اوسط جن کو زین العابدینؑ اور سجاد کہتے تھے۔ اور جو بیمار تھے بستر سے اُٹھ کر باپ کے پاس آئے۔ اور اُنھوں نے میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت مانگی۔ اور کہا "بابا اولاد اسی دن کے لئے ہوتی ہے۔ کہ ماں باپ پر قربان ہوجائے" حضرت نے جواب دیا "بیٹا! تمہارے سب بھائی مارے گئے۔ تمہارے سوا کوئی بھی باقی نہیں رہا جس سے رسولؐ اللہ تمہارے باپ دادا کی نسل قائم رہے۔ اور تم بیمار بھی ہو۔ میں ان عورتوں کو تمہارے حوالہ

کرتا ہوں ۔ دشمن میرے مرنے کے بعد ان کو بے آبرو نہ کرنے پائیں ۔

بیٹا تمہارے دادا اور میرے باپ علیؑ نے اسلام اور رسول اللہ کو بچانے کے لئے بدر کی لڑائی، اُحد کی لڑائی اور خندق کی لڑائیوں میں یزیدی خاندان کے بڑے بڑے سرداروں کو قتل کیا تھا۔ آج یزید کی فوج اسی کا بدلہ مجھ سے اور میری اولاد سے لے رہی ہے۔ میرے نانا اور میرے باپ نے اسلام کو بچانے اور مسلمانوں کو حملوں سے بچانے کے لئے جنگ کی تھی۔ اور میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے بچاؤ کے لئے یہ قربانیاں دے رہا ہوں۔ صبر و ہمت سے کام لینا۔ تمہارے بڑے بھی مصیبت کے وقت صبر کرتے تھے۔ تم بھی صبر کرنا۔ پھر عورتوں سے فرمایا: "تم رسول اللہ کی آل اولاد ہو۔ مصیبت سے گھبرا نہ جانا۔ اِس دُنیا میں مصیبت بھی ہمیشہ نہیں رہتی۔ اور راحت بھی فنا ہو جاتی ہے۔ لیکن صبر اور بے صبری کی یاد ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ یہ کہہ کر حضرت نے رسول اللہ کا عمامہ اپنے سر پر باندھا۔ اور حضرت علیؑ کی تلوار ہاتھ میں لی۔ اور سب کو خدا حافظ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہوئے۔ اور میدانِ جنگ میں دشمن کی صفوں کے سامنے آ کر یزید کی فوج کے سپہ سالار عُمر سعد اور دوسرے سرداروں شمر بن ذی الجوشن وغیرہ کو مخاطب کر کے فرمایا: "اے عمر سعد تو سعد بن وقاص فاتح ایران کا بیٹا ہے۔ تو مجھے اور تیرا باپ میرے باپ کو اور میرے نانا کو جانتا تھا۔ تم نے میرے نانا محمد رسول اللہ کا دین اسلام قبول کیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ ہم ہاشم کی اولاد ہیں جو کعبہ کے متولی تھے۔ اور سارے ملک عرب میں اُن کی عزت تھی۔ اِس لئے ہاشم کا بھائی اُمیہ اُن کی عزت سے حسد کرتا تھا۔ پھر ہاشم کے بیٹے عبد المطلب اور اُن کے بیٹے ابو طالب جو میرے باپ علی کے باپ تھے کعبہ کے متولی ہوئے۔ اور اُمیہ کی اولاد اُن کی عزت کی دشمن رہی۔ اور جب خدا نے عبد المطلب کے پوتے محمدؐ کو اپنا رسول بنایا تو اُمیہ کی اولاد کو بہت زیادہ حسد ہوا۔ اور یزید کا دادا ابو سفیان رسول اللہ سے بدر اور اُحد اور خندق کے میدانوں میں لڑا اور میرے باپ علیؑ نے ہمیشہ اُمیہ کی اولاد کو شکست دی۔ یزید کی دادی ہند نے

رسول اللہ کے چچا حمزہؓ کو قتل کرایا۔ اور اُن کا کلیجہ چبایا۔

اے لوگو! میں حکومت کا شوقین نہیں ہوں۔ میرے باپ بھی حکومت و خلافت کے طلب گار نہیں تھے۔ کیا رسول اللہ نے اپنے آخری حج کے بعد ایک لاکھ مسلمانوں کے سامنے یہ تقریر نہیں کی تھی۔ کہ جس کا میں حاکم ہوں علیؓ بھی اُس کے حاکم ہیں۔ مگر میرے باپ علیؓ نے رسول اللہ کی وفات کے بعد حکومت نہیں چاہی اور ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ خلیفہ ہوگئے۔ اور میرے باپ نے اِن تینوں کی حکومتوں کو مدد دے کر کامیاب کیا۔ اور عثمانؓ کے قتل کے بعد جب مسلمانوں نے بے حد مجبور کیا تب میرے باپ نے خلافت اور حکومت قبول کی۔ مگر تم نے دھوکہ سے اُن کو قتل کر دیا۔ پھر تم نے اصرار کر کے میرے بڑے بھائی حسنؑ کو اپنا خلیفہ بنایا اور انھوں نے چھ مہینے حکومت کی۔ آخر معاویہ کی بغاوت ہوئی۔ اور میرے بھائی نے مسلمانوں کو خانہ جنگی سے بچانے کے لئے حکومت معاویہ کو اِس شرط پر دیدی۔ کہ اُن کے بعد اُن کا بیٹا یزید بادشاہ نہ ہو۔ بلکہ وہ بادشاہ ہو کہ جس کو سب مسلمان مل کر انتخاب کریں۔ مگر معاویہ نے میرے بھائی کو زہر دلوا دیا۔ اور اپنے بیٹے یزید کو مسلمانوں کی عام رائے کے خلاف بادشاہ بنا دیا۔ یزید اسلام کا پابند نہیں ہے اور وہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں اُس کی بادشاہی قبول کروں۔

تم اِس بات کو اسی طرح جانتے ہو جس طرح اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو جانتے ہو۔ کہ ساری دنیا کے مسلمان میرے نانا کا کلمہ پڑھتے ہیں اور تم بھی پڑھتے ہو۔ اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ قرآن میں خدا نے میرے خاندان کو پاک خاندان فرمایا ہے۔ اِس لئے حجاز اور مصر اور عراق اور ایران اور خراسان و افغانستان کے سب مسلمان میرے حامی ہیں۔ مگر میں خود اپنی حکومت نہیں چاہتا۔ اور یہاں تم سے لڑنے نہیں آیا تھا۔ بلکہ میرے باپ کے پایۂ تخت کوفہ کے سرداروں نے مجھے ملنے کے لئے بلایا تھا۔ اگر میں حکومت اور لڑائی چاہتا تو ایران اور خراسان سے لاکھوں فوجیں بلا کر لاتا۔ اور زمین پر اُمیہ کی اولاد کا ایک آدمی زندہ نہ چھوڑتا۔ اگر میں لڑنے آتا تو اپنے ساتھ عورتوں اور بچوں کو نہ لاتا۔

اے عمر سعد تو نے رسول اللہ کے گھر والوں پہ پانی بند کر دیا۔ اور میرے بچوں کو میری آنکھوں کے سامنے کئی دن پیاسا رکھ کر قتل کر دیا۔ تو دنیا کے لالچ میں ہے۔ میں آخرت کے خیال میں ہوں۔ میں نے اپنا سب کچھ اسلام کی آزادی اور حق کی آزادی اور جمہوریت کی آزادی پہ قربان کر دیا۔ اب بس میری ایک جان رہ گئی ہے۔ اور میں اس کو بھی خدا کے راستہ میں قربان کرنے آیا ہوں۔ اے سعد وقاص کے بیٹے سامنے آ جس طرح میرے باپ نے یزید کے باپ معاویہ کو صفین کی لڑائی میں پکارا تھا۔ کہ مسلمانوں کو کیوں قتل کراتا ہے۔ تو خود میرے سامنے آ۔ ہم تم لڑیں اور مسلمانوں کو بچا لیں۔ مگر وہ چھپ گئے اور سامنے نہ آئے۔ آج میں بھی تجھ کو پکارتا ہوں۔ دیکھ میں تین دن کا پیاسا ہوں اور میرے چاروں طرف میرے جوان بیٹے اور دودھ پیتے بچے اور ساتھی مرے پڑے ہیں۔ اور خیمہ میں فقط پیاسی اور بے کس عورتیں رہ گئی ہیں۔ اور ایک آدمی بھی اس وقت میرا مددگار نہیں ہے۔ کیا ایسے وقت میں دنیا کا کوئی آدمی اپنے حواس قائم رکھ سکتا ہے؟ مگر میں حسینؓ علیؓ کا بیٹا۔ ابوطالب کا پوتا۔ محمد رسول اللہؐ کا نواسہ چونکہ حق پر ہوں اس واسطے میرا دل مضبوط ہے۔ اور میں ان مصیبتوں سے کچھ بھی نہیں گھبرایا۔ آگے بڑھ اور مقابلہ کر۔ عمر سعد یہ تقریر سن کر چھپ گیا۔ اور اپنی فوج کو اشارہ کیا جس نے آگے بڑھ کر چاروں طرف سے حضرت امام حسینؓ پر تلواروں اور تیروں اور برچھوں سے حملہ کیا۔ اور حضرت امام حسینؓ نے سیکڑوں کے وار بچانے شروع کئے اور خود بھی وار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ دشمنوں کی صفیں ٹوٹ گئیں۔ اور وہ چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ بچو ابوطالب کے پوتے کے وار سے بچو۔ فاطمہ کا بیٹا دائیں طرف سے آیا ہے اُدھر سے ہٹو۔ بائیں طرف والے پکارتے تھے۔ علیؓ کے بیٹے کو گھیر لو۔ وہ پیاسا ہے۔ اور اکیلا ہے۔ تم ڈرتے کیوں ہو؟ بھاگتے کیوں ہو؟۔

امام حسینؓ نعرے لگاتے تھے۔ اَنَا ابْنُ رَسُوْلِ اللّٰہِ - اَنَا ابْنُ اَسَدِ اللّٰہِ - اَنَا سَیْفُہٗ - اَنَا سَہْمُہٗ - اَنَا رُمْحُہٗ - اَنَا حَقٌّ - اَنَا اٰیَۃٌ مِّنْ اٰیَاتِ

اللہ یعنی میں رسول اللہ کا فرزند ہوں میں شیر خدا کا بیٹا ہوں۔ میں ایک تلوار ہوں۔ میں ایک تیر ہوں۔ میں ایک نیزہ ہوں۔ میں حق ہوں۔ میں ایک نشانی ہوں خدا کی نشانیوں میں۔

آخر سب بڑے بڑے افسروں نے مل کر حملہ کیا۔ حضرت امام حسینؓ کے ستر زخم لگ چکے تھے۔ اور دھوپ بہت تیز تھی۔ دو بجے کا وقت تھا۔ اور وہ تین دن کے پیاسے بھی تھے۔ گھوڑا زخمی ہو کر گرا۔ اور وہ بھی زمین پر گرے۔ اور انھوں نے اپنی عورتوں کے خیمہ کی طرف دیکھا۔ اور پھر آسمان کو دیکھا اور فرمایا۔ یا اللہ تیرے سوا ان غریب عورتوں کا کوئی حافظ و ناصر نہیں ہے۔

قتل حضرت زخموں سے چور زمین پر پڑے تھے۔ مگر اس قدر ہیبت تھی کہ کسی دشمن کو آگے بڑھنے اور سر کاٹنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ عمر سعد اور شمر بار بار پکارتا تھا۔ کہ ڈرتے کیوں ہو۔ وہ مر چکا ہے۔ سر کاٹ لو۔ مگر کوئی آگے نہ بڑھتا تھا۔ آخر خولی بن یزید آگے بڑھا۔ اور اُس نے خنجر میان سے نکالا۔ اور اپنے دونوں گھٹنے امام حسینؓ کے سینہ پر رکھے۔ اور خنجر آگے بڑھایا حضرت نے تیز نظر سے اُس کو دیکھا۔ وہ کانپنے لگا۔ حضرت نے کمزور آواز میں کہا۔ تو پہلے اپنا سینہ دکھا۔ میرے باپ نے کہا تھا حسین کے قاتل کے سینہ پر سفید داغ ہوں گے۔ اور اُس کے دو دانت بڑے بڑے آگے کو نکلے ہوئے ہوں گے۔ خولی نے سینہ دکھایا تو اُس پر سفید داغ تھے۔

حضرت نے فرمایا۔ "اے شخص میرے چند سانس باقی ہیں۔ میں خود ہی مر جاؤں گا۔ اس کے بعد سر کاٹ لیجیو۔ زندہ کا سر کاٹے گا تو قیامت تک لوگ کہیں گے" کہ خولی ابن رسول اللہ کا قاتل تھا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی مسلمان بھی میری وجہ سے بدنام ہو۔ خولی نے جواب دیا۔" اے حسینؓ تجھ جیسا بہادر زمین پر پیدا نہ ہوا ہوگا۔ تو مرتے وقت بھی مسلمانوں کی بدنامی کا خیال کرتا ہے۔ مگر میں یزید اور عمر سعد اور ابن زیاد حاکم کوفہ کے حکم سے تیرا سر جدا کرتا ہوں۔ اور جانتا ہوں کہ تو حق پر ہے۔ اور تیرا قتل سب سے بڑا گناہ ہے۔ مگر حاکم کے حکم

کا پورا کرنا میرے لئے ضروری ہے

یہ کہہ کر خولی نے حضرت کے گلے پر خنجر چلایا۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور گلا پیاس کے سبب اتنا خشک تھا۔ کہ خنجر اچھی طرح چلتا نہ تھا۔ خولی نے ایک ہاتھ سے حضرت کی زلفیں پکڑ لیں۔ اور دوسرے ہاتھ سے خنجر چلایا۔ اور سر کاٹ کر زلفوں میں لٹکا لیا۔ اور کھڑا ہو گیا۔ اور دیوانوں کی طرح چیخا۔ دیکھو۔ یہ حسینؑ بن علیؑ کا سر ہے۔ یہ ابو طالب کے پوتے کا سر ہے۔ یہ فاطمہؑ کے بیٹے کا سر ہے۔ جو یزید کی حکومت کو نہ مانتا تھا۔ اور جس کے باپ نے یزید کے بزرگوں کو قتل کیا تھا۔ آج میں یزید کے دربار سے سب سے بڑے انعام کا مستحق ہوں۔ کہ میں نے دنیا کے سب سے بڑے آدمی کا سر کاٹا ہے۔ اور بدر کے مقتولوں کا بدلہ لیا ہے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ اُس کا سُننا کسی آدمی سے برداشت نہ ہو سکے گا۔ بس یوں سمجھ لو کہ ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی۔ جب خیمے جلائے گئے۔ اور حضرت کی عورتوں کو لُوٹا اور ستایا گیا۔

میرے پانچ بادشاہ

تاج پوشی لندن کی تقریب میں

خواجہ حسن نظامی صاحب کی تقریر جو ۱۰ مئی ۱۹۳۷ء کو دہلی ریڈیو میں ہوئی تھی

آج سب کے کان لندن کی تاج پوشی کا غلغلہ سن رہے ہیں۔ سب کی آنکھیں اور دل اسی منظر کی طرف متوجہ ہیں۔ پھر میری بات کون سنے گا؟ مگر کوئی سنے یا نہ سنے۔ دیکھے یا نہ دیکھے مجھے اپنا ایک جذبہ ادا کرنا ہے۔ وہ جذبہ نہیں جو محکوموں کو حکم دے کر ابھارا جاتا ہے۔ بلکہ وہ جذبہ جو ایسے حالات کے وقت خود بخود ہر آدمی کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے جمائی لینے والے کو دیکھ کر دوسروں کو جمائی آنے لگتی ہے۔ بس میں بھی تاج پوشی کی چہل پہل میں آپ ہی آپ یہ بولنا چاہتا ہوں۔ کہ میرے جدِ اعلیٰ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے چھ سو برس پہلے اپنی ۹۵ برس کی زندگی میں سات بادشاہ دیکھے تھے۔ یا سات بادشاہوں کی حکومت دیکھی تھی غیاث[۱] الدین بلبن۔ معز[۲] الدین کیقباد۔ جلال[۳] الدین خلجی۔ علاء[۴] الدین خلجی۔ قطب[۵] الدین خلجی۔ غیاث[۶] الدین تغلق۔ محمد[۷] تغلق۔

اور میں نے اپنی ۶۱ برس کی عمر میں پانچ بادشاہ دیکھے ہیں۔ یا پانچ بادشاہوں کی حکومت دیکھی ہے۔ ملکہ[۱] وکٹوریہ۔ ایڈورڈ ہفتم۔ جارج پنجم۔ ایڈورڈ ہشتم۔ جارج ششم اور پانچ کے عدد سے جو مذہبی مناسبت مجھے ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میری زندگی انہی پانچ میں ختم ہو جائے گی۔

میں نے بچپن کی بے خبری سے ہوش کی دنیا میں قدم رکھا تو ملکہ وکٹوریہ کا نام سنا۔ لفافہ اور کارڈ اور روپے پیسہ پر ملکہ کی تصویریں دیکھیں جو ملکہ کے شباب کی تھیں۔ اپنی اماں سے ملکہ کی تعریفیں بھی بہت سنیں۔ اور یہ بھی سنا کہ غدر ۱۸۵۷ء کے ایک سال بعد ہی ملکہ

نے معافی کا عام اعلان شائع کیا تھا۔ اور آگرہ کے ایک مولوی صاحب کو لندن بلا کر اردو سیکھی اور خفیہ اسلام قبول کیا تھا۔ پھر ملکہ کے بڑھاپے کے ٹکٹ بھی دیکھے۔ مگر ہر زمانہ کی صورت میں ایک وقار پایا۔ نیک خیالی اور ہمدردی کے نشان چہرہ پر دیکھے۔ پھر ملکہ کے بیٹے ایڈورڈ ہفتم کا زمانہ آیا۔ وہ ڈاڑھی والے۔ بھاری بھرکم۔ بڑی بڑی کٹورہ سی آنکھوں اور چوڑے سینے بلند پیشانی کے انگریز تھے۔ اُن کی حکومت کا زمانہ بھی ملکہ وکٹوریہ کی طرح امن اور خوش حالی کا زمانہ تھا اور وہ پیس میکر یعنی "امن ساز" کے لقب سے مشہور تھے۔

جارج پنجم } ایڈورڈ ہفتم کے بعد اُن کے بیٹے جارج پنجم بادشاہ ہوئے۔ اور وہ بھی ڈاڑھی رکھتے تھے۔ اور اُن کی آنکھیں بھی بڑی اور خوبصورت تھیں۔ جب وہ ولی عہد تھے اور پرنس آف ویلز کہلاتے تھے۔ تو اپنی ملکہ میری کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ اور جب درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ میں آئے تو میں نے اُن سے ملاقات کی تھی۔ اور ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا۔ جس سے اُن کی نیک دلی ظاہر ہوتی تھی۔ اور وہ واقعہ یہ تھا کہ جب وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مزار کے سامنے آ کر کھڑے ہوئے تو میں نے اردو زبان میں اُن سے کہا۔ کہ یہ وہ مقام ہے۔ جہاں ترک اور افغان اور مغل شہنشاہ اظہار ادب کے لئے اپنے سر اِس چوکھٹ پر رکھ دیتے تھے۔

میری بات کا انگریزی ترجمہ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سر چارلیس ریواز نے اُن کو سنایا جو اُن کے ساتھ تھے۔ تو انھوں نے اپنی ٹوپی اتار لی۔ اور اپنے سر کو مزار کی طرف جھکا کر مجھ سے کہا۔ کہ "میں بھی اِن ولی کا ادب کرتا ہوں"۔

اس واقعہ کا لوگوں پر بہت زیادہ اثر ہوا۔ اور جب یہ خبر اخباروں میں شائع ہوئی۔ تو تمام ہندوستان میں شہزادہ کی تعریف کی گئی۔ اسی دن ایک اور دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ جب پرنس اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور مسٹر ہمفریز ڈپٹی کمشنر دہلی نے گاڑی کا دروازہ بند کیا۔ تو درگاہ کے ایک بوڑھے آدمی نے پرنس سے کہا۔ شہزادہ صاحب یہ ہمارے ڈپٹی کمشنر

بہت اچھے آدمی ہیں۔ دیکھئے انھوں نے کوچوان کی طرح آپ کی گاڑی کا دروازہ بند کیا ہے۔ اپنے والد سے ان کی سفارش کیجئے گا تاکہ ان کو کوئی اور بڑا عہدہ مل جائے۔

جب اس دلچسپ بات کا ترجمہ پرنس کو سنایا گیا۔ تو وہ اور ملکہ دونوں ہنسنے لگے۔ اور اُن کو اس بات سے بہت لطف آیا۔

جارج پنجم کی تصویر ٹکٹ اور سکہ میں دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ بہت مضبوط جسم کے ہیں۔ مگر وہ بہت دبلے اور کمزور تھے۔ اور شیشہ کی ایک صراحی میں دودھ اُن کے ساتھ رہتا تھا جس کو تھوڑی دیر کے بعد پیتے تھے۔ چنانچہ مذکورہ درگاہ میں بھی ایک چبوترہ پر بیٹھ کر انھوں نے دودھ پیا تھا۔

۱۹۱۱ء میں جب وہ بادشاہ ہو کر آئے تب بھی انھوں نے اس درگاہ کو یاد رکھا۔ اور ایک رقم بھیجکر درگاہ کے پردے بنوائے۔

ایڈورڈ ہشتم } جارج پنجم کے ولی عہد بھی بحیثیت پرنس آف ویلز ہندوستان میں آئے تھے۔ جو تخت نشینی کے بعد ایڈورڈ ہشتم کے لقب سے مشہور ہوتے تھے۔

یہ ڈاڑھی مونچھ منڈاتے ہیں۔ اور اُن کی آنکھیں بھی بڑی اور خوبصورت ہیں۔ میں اُن سے وقت مقرر کر کے کیمپ دہلی میں ملنے گیا تھا۔ ملاقات کا وقت پانچ منٹ مقرر ہوا تھا مگر انھوں نے پندرہ منٹ تک بات کی تھی۔

میں نے پوچھا۔ آپ نے دہلی کو پسند کیا۔ اُنھوں نے جواب دیا۔ وہ میرا پایۂ تخت ہے۔ مگر میں تم لوگوں کی طرح آزادی کے ساتھ اس شہر کو نہیں دیکھ سکا۔ کیونکہ مجھے ایک مقررہ پروگرام کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ جس کو میں پسند نہیں کرتا۔

پرنس کے اس فقرہ سے میں نے اُن کی آزاد خیالی کا اندازہ لگا لیا تھا۔ جو بادشاہ ہونے کے بعد ساری دنیا کے سامنے آگیا۔ کہ اُنھوں نے اپنی خوشی اور آزادی کا مالک رہنے کے لئے تاج و تخت چھوڑ دیا۔

جارج ششم ایڈورڈ ہشتم کی دست برداری کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی جارج ششم کے نام سے تخت نشین ہوئے۔ جن کی تاج پوشی کا یہ جلسہ ہو رہا ہے۔

یہ بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح ڈاڑھی مونچھ منڈاتے ہیں۔ اور اپنے بڑے بھائی سے صورت شکل میں بہت مشابہ ہیں۔ میں نے اُن کی فقط تصویر دیکھی ہے۔ خود اُن کو نہیں دیکھا۔ یہ پانچویں بادشاہ ہیں۔ جو میری عمر میں ہندوستان کے حکمراں ہوئے ہیں میری عادت خوشامد کی نہیں ہے۔ میں بغیر کسی دباؤ اور خوشامد کے یہ کہتا ہوں۔ کہ یہ پانچوں بادشاہ اپنی رعایا سے محبت رکھنے والے اور اُن کے دُکھ سکھ سے تعلق رکھنے والے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کو تو خدا نے اقبال ایسا دیا تھا۔ کہ اُنہی کے زمانہ میں ہندوستان برطانی حکومت میں داخل ہوا تھا۔ اور اُن کی حکومت کا سارا زمانہ امن سے گزرا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کو اردو زبان کا بہت شوق تھا۔ اور انھوں نے آگرہ کے ایک مسلمان کو لندن بلا کر اردو زبان سیکھی تھی۔ اور وہ اردو زبان میں اپنے دستخط کر لیتی تھیں۔ چنانچہ میں نے اُن کے اردو دستخط دیکھے ہیں۔

ایڈورڈ ہفتم کا زمانہ بھی امن و امان کا زمانہ تھا۔ البتہ جارج پنجم کے زمانہ میں جنگ یورپ ہوئی تھی۔ ایڈورڈ ہفتم کی مہمان نوازی کا ایک قصہ سُنانے کے قابل ہے۔ کہ ایک دفعہ اُن کے ہاں شہنشاہ ایران مہمان تھے۔ کھانے کے بعد انگریزی رواج کی موافق کٹوروں میں پانی آیا۔ جس میں انگلیاں ڈبو کر صاف کر لی جاتی ہیں۔ اس پانی میں گلاب کے پھول پڑے ہوئے تھے۔ شاہ ایران اس رواج سے واقف نہ تھے انھوں نے خیال کیا کہ یہ پانی پینے کے لئے آیا ہے۔ اس لئے انھوں نے وہ پانی پی لیا۔ ایڈورڈ ہفتم نے اپنے مہمان کو یہ پانی پیتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے بھی وہ پانی پی لیا۔ تاکہ مہمان کو شرمندگی نہ ہو۔ اور میز پر جتنے بڑے بڑے لارڈ بیٹھے تھے سب نے وہ پانی پی لیا۔

جارج پنجم باوجود بڑھاپے اور جسم کی کمزوری کے آخری سانس تک خدمت خلق کا

کام کرتے رہے تھے

ایڈورڈ ہشتم بھی بہت اچھے بادشاہ تھے۔مگر نئے زمانہ کے نوجوانوں کی طرح اُن میں آزادی کا جذبہ زیادہ تھا۔اور وہ پُرانے رسم ورواج کی پابندی نہ کرنی چاہتے تھے۔اِس لئے انھوں نے تاج وتخت چھوڑ دیا۔

جارج ششم بھی آزاد خیال نوجوان ہیں۔لیکن وہ اپنی قوم اور اپنے دربار کے رواج کے پابند ہیں۔اور وہ ہر رواج اور دستور کے حامی ہیں۔اُن کی بیوی بہت خوبصورت اور نیک سیرت ہیں۔اور یہ دونوں صاحب اولاد بھی ہیں۔اور ایڈورڈ ہشتم جب بادشاہ تھے تو کہا کرتے تھے کہ میرے بھائی کو خدا نے اپنی برکت عطا فرمائی ہے۔یعنی وہ صاحب اولاد ہیں۔

ہندوستان کے تمام باشندے نرم ہوں یا گرم سب ہی برطانیہ کے شاہی خاندان سے محبت رکھتے ہیں۔کیونکہ ہندوستان کی سب ہندو مسلمان قومیں ہمیشہ سے شاہی خاندان کے ساتھ محبت کرتی آئی ہیں۔

طرز حکومت سے بعض اوقات بعض لوگوں کو اختلاف بھی ہوتا ہے۔مگر شاہی خاندان کی کبھی کسی شخص نے مخالفت نہیں کی۔اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ہندوستانی لوگ شاہی خاندان سے محبت رکھتے آئے ہیں۔

آج اگرچہ تاج پوشی کا دربار لندن میں ہو رہا ہے جو ہندوستان سے سات ہزار میل دور ہے۔تاہم تمام ملک کی ہندو مسلمان قوموں میں اِس دربار کا چرچہ ہے۔اور ہر ایک کی زبان پر بادشاہ اور اُن کی ملکہ کا ذکر موجود ہے۔

خدا کرے جارج ششم کی تاج پوشی برطانیہ کے لئے اور شاہی خاندان کے لئے اور ہندوستان کے لئے مبارک ہو۔آمین۔

جارج پنجم کی رحم دلی کا ایک قصہ: اسی سلسلہ میں سابق شہنشاہ جارج پنجم کی رحم دلی کا ایک قصہ بھی سُنانے کے قابل ہے۔کہ جب وہ پرنس آف ویلز کی حیثیت میں

دِلّی آتے تو میں نے اُن کو اردو زبان میں ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا۔ کہ اے برطانیہ کے ولی عہد آپ کو معلوم ہو کہ دِلّی شہر آخر زمانہ میں مغل بادشاہوں کا پایہ تخت تھا۔ اور آخری مغل بادشاہ دہلی کی اولاد اس شہر میں اب بھی بکثرت موجود ہے۔ ان میں سے بعض کے نام آپ کی گورمنٹ نے پانچ روپے ماہوار گزارہ مقرر کر دیا ہے۔ اور بہت سے عورت و مرد شہزادے ابھی ایسے موجود ہیں جن کے نام گزارہ مقرر نہیں ہوا ہے۔ اول تو پانچ روپے ماہوار میں بادشاہ کی اولاد کو گزارہ کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ جن شہزادوں کا گزارہ مقرر نہیں ہوا۔ وہ محنت اور کام کے عادی نہ ہونے کے سبب کوئی پیشہ نہیں کر سکتے۔ اور فاقہ کشی میں مبتلا ہیں۔ ان میں بعض اندھے ہیں اور بعض بہت بوڑھے ہیں۔ اور اکثر پردہ نشین عورتیں ہیں۔ آج کی رات آپ کی میز پر اتنا کھانا بچ جائے گا جس کو سو پچاس آدمی اپنا پیٹ بھرنے کو کافی سمجھیں گے۔ مگر آج ہی کی رات بہت سے شہزادے اور شہزادیاں اور اُن کے چھوٹے چھوٹے بچے بھوکے سوئیں گے۔ کیونکہ اُن میں سے اکثر کو ایک وقت بھی بہت مشکل سے روٹی میسر آتی ہے۔ اگر آپ اپنی حکومت ہند اور حکومت دہلی کو بحیثیت ولی عہد سلطنت برطانیہ کے حکم دیں تو ان باقی شہزادوں کی گزر اوقات کا سامان بھی ہو جائے۔ اور وہ سب آپ کی اور تمام شاہی خاندان کی صحت و سلامتی کے لئے دعائیں کریں۔

ان شہزادوں میں ایک شہزادہ نصیر الملک ہے۔ جو بہادر شاہ کا پوتا ہے۔ اور اُس کے دونوں پاؤں فالج سے خراب ہو گئے ہیں۔ اور وہ چل پھر نہیں سکتا۔ اس واسطے اپنے دونوں ہاتھوں کے سہارے گھسٹ گھسٹ کر بازار میں جاتا ہے۔ اُس کے گلے میں ایک جھولی پڑی رہتی ہے۔ وہ بازار میں راہ گیروں کو دونوں طرف حسرت سے دیکھتا جاتا ہے اور آنسو بہاتا جاتا ہے۔ کیونکہ اُس کو یاد آتا ہے کہ میں ہندوستان کے سابق شہنشاہ کا پوتا ہوں۔ اور کسی زمانہ میں یہی راہ گیر اسی شہر کے بازاروں میں مجھے سلام کرتے تھے۔ اور جب میں

لال قلعہ سے گھوڑے پر سوار ہو کر ان بازاروں میں سیر کرنے کے لئے آتا تھا تو سب دکان دار میری تعظیم کے لئے اپنی دکانوں سے اتر کر نیچے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور مجھے جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ اور جب میں آگے بڑھ جاتا تھا تو آپس میں کہتے تھے۔ کتنا خوبصورت شہزادہ ہے اور کیسا اچھا لباس ہے۔ اور کس قدر قیمتی گھوڑے پر سوار ہے۔ یہ وہی شہزادہ ہے۔ جس نے کل جامع مسجد دہلی میں ایک ہزار فقیروں کو کھانا کھلایا تھا۔ اور ایک ہزار کمبل بانٹے تھے۔ تاکہ وہ سردی سے محفوظ رہ سکیں۔ مگر آج انقلاب کے بعد یہ سارا شہر مجھے بھول گیا۔ اور کوئی مجھے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ کہ مجھے کئی کئی وقت روٹی میسر نہیں آتی اور سردی کا کپڑا بھی میرے پاس نہیں ہے۔ اور بیماری کے علاج کے لئے ایک پیسہ بھی موجود نہیں ہے۔ جو لوگ میری اس بری حالت پر رحم کرتے ہیں تو ایک پیسہ میری جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ مگر وہ بھی یہ نہیں جانتے کہ میں سابق شہنشاہ ہند کا پوتا ہوں۔ بس یوں ہی محتاج اور اپاہج فقیر سمجھ کر مجھے پیسہ دیدیتے ہیں

جب میں نے یہ خط پرنس آف ویلز کو بھیجنا چاہا۔ تو میرے دوستوں نے مجھے منع کیا۔ کہ ایسا خط بھیجنا بہت بڑی گستاخی ہے۔ مگر میں نے جواب دیا کہ پرنس آف ویلز کو میں نے کل اپنی درگاہ میں دیکھا تھا۔ اور ان سے ایک بات کہی تھی۔ جس پر انھوں نے فوراً عمل کیا تھا۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ وہ میرے اس خط سے ناراض نہیں ہوں گے اور ان کو گزشتہ زمانہ کے بادشاہ کی اولاد پر ضرور رحم آئے گا۔ اور اگر انھوں نے اس خط کو گستاخی سمجھا اور اس کی وجہ سے مجھے جیل خانہ میں جانا پڑا تب بھی کچھ حرج نہیں ہے۔ کیونکہ مجھے اپنی نیت کا ثواب مرنے کے بعد خدا کے ہاں مل جائے گا۔

چنانچہ میں نے یہ خط پرنس آف ویلز کو بھیجدیا۔ اور انھوں نے اپنے سکرٹری سے میرے خط کا ترجمہ کرا کر ڈپٹی کمشنر صاحب دہلی کو حکم دیا۔ کہ سابق بادشاہ کی اولاد کی تکلیف کو فوراً دور کر دیا جائے۔ چنانچہ جب پرنس آف ویلز دہلی سے چلے گئے تو ڈپٹی کمشنر

صاحب دہلی نے سب شہزادوں کی تنخواہیں ڈبل کردیں۔ یعنی جن کو پانچ روپے ماہوار ملتے تھے اُن کے دس روپے ماہوار کر دئے۔ اور بہتر شہزادوں کے نام نئی تنخواہیں دس دس روپے ماہوار جاری کردی گئیں۔ اُن لوگوں میں جن کے نام نئی تنخواہیں جاری ہوئی تھیں میرزا نصیر الملک بھی تھے۔ اور بہت سے شہزادے اور شہزادیاں بھی تھیں جو آنکھوں کی معذوری یا کسی اور مجبوری کے سبب کچھ کام نہ کر سکتی تھیں۔ اور آج تک یہ تنخواہیں اُن کے نام جاری ہیں ۔ اور جو مر گئے اُن کی تنخواہیں بند ہوگئی ہیں۔ چنانچہ مرزا نصیر الملک کا بھی انتقال ہوگیا ہے۔

اِس قصہ سے سابق شہنشاہِ برطانیہ جارج پنجم کی رحمدلی اور قوت برداشت ظاہر ہوتی ہے۔ کوئی اور بادشاہ ہوتا تو میرے خط سے خفا ہوجاتا۔ اور مجھ کو ایسا خط لکھنے کی سزا دیتا۔ مگر یہ برطانیہ کے شاہی خاندان کی ایک خوبی تھی کہ پرنس آف ویلز نے بُرا نہ مانا۔ اور سابق شہنشاہ کی اولاد کو فاقہ کشی سے بچالیا۔ جب شہنشاہ جارج پنجم کے بیمار ہونے کی خبر آئی تو میں نے سُنا تیموری شہزادوں کے گھروں میں بڑھیا عورتیں دعائیں مانگ رہی تھیں کہ یا اللہ اُس بادشاہ کو سلامتی دے جس نے بے کسی اور بے بسی کی بھوک پیاس میں ہماری مدد کی تھی۔

شادی کی بُری رسمیں

۱۸ مئی ۱۹۳۷ء کی شام کو خواجہ صاحب کی زبان سے دلّی ریڈیو کے ذریعہ نشر ہوئی۔

دلّی ریڈیو میں پرانے زمانہ کی شادیوں کا قصہ سُنکر ایک مسلمان بیوی نے اپنے شوہر سے کہنا شروع کیا۔ جب کہ وہ کھانا کھاکر آرام کُرسی پر بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔

سُنتے بھی ہو! خدا رکھے تمہارا بیٹا بھی شادی کے قابل ہوگیا۔ پندرہ برس کی عمر ہوگئی اور بیٹی بھی بارہ سال کی ہے۔ اب اُس کو بٹھائے رکھنا اچھا نہیں ہے۔ ان دونوں کی شادیوں کا فکر کرنا چاہئے۔ میں کئی دفعہ کہہ چکی ہوں۔ مگر تم پروا نہیں کرتے۔ اِس کان سُنتے ہو۔ اُس کان اڑا دیتے ہو۔

میاں نے حقہ کا دُھواں منہ سے اڑاتے ہوئے کہا "تمہیں تو رات دن شادیوں کا خلجان رہتا ہے۔ خبر بھی ہے کہ شاردا ایکٹ پاس ہوگیا ہے۔ اب کسی لڑکے کی شادی اٹھارہ برس کی عمر سے پہلے اور لڑکی کی شادی چودہ برس سے پہلے نہیں ہوسکتی۔ اور جو اس کے خلاف کرے گا اُس کو سرکار کی طرف سے سزا دیجائے گی۔ تمہارے لڑکے کی عمر ابھی پندرہ سال کی ہے۔ اور لڑکی بارہ برس کی ہے۔ دونوں کی شادیوں میں ابھی تین تین برس کی دیر ہے۔

بیوی نے خفا ہوکر کہا "سرکار کو شادی بیاہ کے معاملہ سے کیا تعلق؟ بیٹا بیٹی ہمارے ہیں ہم جب چاہیں اُن کی شادیاں کریں۔ سرکار روکنے والی کون ہوتی ہے؟

میاں نے کہا "سرکار نے ہمارے ہی فائدہ کے لئے یہ قانون بنایا ہے۔ سب حکیم ڈاکٹر کہتے ہیں کہ "بچپن کی شادیوں سے بہت نقصان ہوتا ہے" اور خدا نے بھی قرآن مجید میں اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ کا لفظ فرمایا ہے"۔

بیوی نے کہا "اِس آیت کا کیا مطلب ہے"

میاں نے کہا۔ "یہ مطلب ہے کہ جب بیٹا بیٹی بالغ ہو جائیں۔ یعنی شادی کی عمر کو پہنچ جائیں تب نکاح کرنا چاہئے۔

یہ سُنکر بیوی بولیں "اگر خدا نے قرآن میں یہ کہا ہے تو خدا کا حکم سر آنکھوں پر۔ اور تین برس ٹھہر جاؤں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان بچوں کے سہرے کے پھول نہیں کھلے۔ اور بڑے بوڑھے کہہ گئے ہیں کہ شادیاں جب ہی ہوتی ہیں۔ کہ جب بچوں کے سہرے کے پھول کھلتے ہیں۔ خیر اگر تین برس کے بعد شادیاں کرنی ہیں تب بھی سامان تو ابھی سے کرنا چاہئے۔ سونا اگرچہ آجکل مہنگا ہے پھر بھی پانچ چار چیزیں بنوانی ضروری ہیں۔ کپڑا جاپانی اگرچہ سستا ہے مگر وہ نقلی ہوتا ہے۔ اور جلدی خراب ہو جاتا ہے۔ اصلی ریشم کا کپڑا ابھی آنا چاہئے۔ ہم کو دوہرا خرچ کرنا ہے۔ لڑکے کے لئے بری اور سانچق اور لڑکی کے لئے جہیز۔ تین سال بات کرتے گزر جائیں گے آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا چاہئے۔ زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ چیزیں ابھی سے آجائیں گی تو میں سہج سہج تیاری کرتی رہوں گی۔ اور تین برس میں سب سامان ہو جائے گا۔

میاں نے کہا "تین برس کا زمانہ بہت بڑا زمانہ ہوتا ہے۔ اُس وقت تک خبر نہیں رواجوں میں کیا کیا تبدیلیاں ہو جائیں گی۔ اور کپڑے اور زیور کے فیشن بھی بدل جائیں گے لہذا جب وقت آئے گا اُس وقت دیکھا جائے گا۔ ابھی مناسب نہیں ہے۔

بیوی بولیں "اے سبحان اللہ۔ میں کیا انگریزن ہوں۔ جن کے ہاں روز روز فیشن بدلتے ہیں۔ اُن کے ہاں صبح کچھ اور فیشن۔ دوپہر کو کچھ اور۔ اور شام کو وہ بھی بدل گیا۔ اور رات کو سوتے وقت وہ بھی باقی نہ رہا۔ میں تو ہندوستان کی پیدائش ہوں اور لکیر کی فقیر بنی بیٹھی ہوں۔ اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے گی مگر میں اپنے پرانے رسم و رواج کو نہیں چھوڑوں گی۔ مجھے فرنگیوں کی ایک ادا بھی نہیں بھاتی۔ اُن کے ہاں صبح کے کھانے کے کپڑے اور۔ دوپہر کے کھانے کے اور۔ اور رات کے کھانے کے اور۔ کھیل کے کپڑے اور سونے کے کپڑے اور

وہ تو اگر چھینکنا اور کھانسنا بھی چاہتے ہیں تو کھانسی اور چھینک سے کہتے ہیں کہ ذرا ٹھہر جانا
میں ذرا کھانسی اور چھینک کے کپڑے پہن لوں۔ پھر کھانسوں گا اور چھینکوں گا اور اُن کی شادیاں
بھی ایسی ہوتی ہیں جن سے میرے دل کو کوئی لگاؤ نہیں ہے بیٹے بھی اور بیٹیاں بھی اپنی مرضی
سے بر تلاش کر لیتے ہیں۔ بھلا دیکھو تو اُن کی کچی عمریں۔ ناسمجھی کا زمانہ۔ تجربہ نام کو نہیں۔ وہ
بیچارے کیا سمجھیں گے کہ جہاں ہم شادی کر رہے ہیں اُن کا خاندان کیسا ہے؟ اور چال چلن
کیسا ہے؟ اور مزاج کیسا ہے؟ عادت اور خصلت کیسی ہے؟ ہمارے ہاں ماں باپ اور کنبہ
رشتہ والے بر تلاش کرتے ہیں اور اچھی طرح سوچ اور سمجھ کے اور تجربہ سے کام لے کے بر
کا انتخاب کرتے ہیں اور نئی روشنی والوں کی شادیاں بھلا شادیاں ہیں۔ کہ نہ ڈھول نہ
تاشا۔ نہ باجہ گاجا۔ نہ مہمان داری۔ بس نکاح کے دو بول پڑھائے اور اپنے اپنے گھروں
کو چلتے بنے۔ میرے ہاں ان دو پھونسڑوں کے سوا اور کون ہے جہاں میرے ارمان نکلیں صاف
بات ہے۔ میرے ہاں ڈھول تاشے بھی ہوں گے۔ انگریزی باجے بھی ہوں گے۔ نقال اور
بھانڈ بھی آئیں گے۔ رنڈیاں بھی آئیں گی۔ آرائش بھی ہو گی۔ آتش بازی بھی ہو گی اور
تین رات دن مہمان داری بھی ہو گی۔ دولھا دلہن مایوں بھی بیٹھیں گے۔ ان دونوں کے کنگنا
بھی باندھا جائے گا اور اُبٹنا بھی ملا جائے گا۔ مہندی بھی لگائی جائے گی۔ ساچق بھی ہو گی
آرسی مصحف بھی ہو گا۔ اور میرے بیٹے اور داماد کو آرسی مصحف کے وقت یہ بھی کہنا پڑے گا
"بیوی آنکھیں کھولو میں تمھارا غلام ہوں"۔

بیوی کی یہ باتیں سُنکر میاں بہت ہنسے اور اُنھوں نے حقہ ایک طرف ہٹا دیا اور
کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور کہا کہ ہر قوم کی اور ہر ملک کی رسمیں الگ الگ ہوتی
ہیں۔ بیشک میں نئی روشنی کے اس دستور کو پسند نہیں کرتا کہ وہ ہر کام کے لئے الگ الگ کپڑے
پہنتے ہیں۔ کیونکہ اس میں فضول خرچی ہے۔ مگر یہ تو تم بھی مانو گی کہ اس دستور میں صفائی
اور تمیز داری تو بہت ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ نئی روشنی کا یہ رواج اچھا نہیں ہے۔

کہ بیٹا بیٹی بے حجاب ہوکر آپس میں شادی کی باتیں کریں۔ مگر تم بھی اس پرانے رواج کی خرابیوں پر ذرا غور کرلو کہ نہ بیٹا ہونے والی بیوی کی صورت سے واقف ہے نہ عادت خصلت سے واقف ہے۔ اور نہ لڑکیاں ہونے والے شوہر کی کسی بات کو جانتی ہیں۔ ماں باپ جہاں چاہتے ہیں آنکھ بند کرکے شادی کر دیتے ہیں۔ اور یہ تو تم کو معلوم ہے کہ سب لوگ سمجھدار نہیں ہوا کرتے۔ ہزار، دو ہزار آدمیوں میں ایک دو ایسے ہوتے ہیں جو سمجھداری سے رشتے کرتے ہوں۔ ورنہ یوں ہی قسمت اور تقدیر پر بھروسہ کیا اور رشتہ ہوگیا۔ اور میں تاشہ باجے اور ناچ رنگ اور کھانے دانے اور ساچق اور بری اور جہیز اور دھوم دھام کے بھی خلاف ہوں کیونکہ ان میں بہت سی رسمیں تو فضول خرچی کی ہیں۔ اور فضول خرچی سے ہزاروں لاکھوں گھر تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ اور بہت سی رسمیں ایسی ہیں جن کو اسلام نے حرام کر دیا ہے۔ اور اگر ان رسموں کو کیا جائے تو مسلمان بہت گنہگار ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات کافر ہو جاتا ہے۔ ہم مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر فضول خرچی کی رسمیں سیکھی ہیں۔ اور جہیز کی فضول خرچی کا رواج بھی ہندوؤں کی دیکھا دیکھی ہوا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں بیٹی کو ورثہ دینے کا دستور نہیں ہے اس واسطے وہ شادیوں کے موقع پر لڑکیوں کو بہت سا جہیز دیتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے ہاں لڑکی کو آدھا حصہ دیا جاتا ہے۔ تاکہ آدھا حصہ ماں باپ سے ملے۔ اور باقی کا آدھا شوہر کے ہاں سے مہر کی صورت میں مل جاتے۔ پھر مسلمان لڑکیوں کو بہت سا جہیز کیوں دیا جائے۔

میاں کی یہ باتیں سنکر بیوی بولیں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ ہمارے رسولؐ کی بیٹی حضرت بی بی فاطمہؓ کی شادی میں کیا کیا رسمیں ہوئی تھیں میں بس حضرت بی بی کی شادی کی تقلید کرونگی اور سب فضول باتیں چھوڑ دوں گی۔

میاں نے کہا۔ لو سنو! میں تم کو حدیث کی معتبر کتابوں سے رسول اللہ کی بیٹی حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی شادی کا حال سُناتا ہوں۔

حضرت بی بی فاطمہؓ کی عمر ساڑھے پندرہ برس کی تھی۔ اور حضرت علیؓ کی عمر اکیس سال کی

تھی جب حضرت ابوبکرؓ صدیق اور حضرت عمرؓ فاروق حضرت علی کی طرف سے رشتہ کا پیغام لیکر رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور درخواست کی کہ آپ حضرت بی بی فاطمہؓ کا عقد حضرت علیؓ سے کر دیجئے۔ رسولؐ خدا نے فرمایا فاطمہؓ ابھی کم عمر ہے۔ اس کے بعد جو حضرت علیؓ شرماتے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ اور سر جھکا کے چپکے سے حرف مطلب عرض کیا۔ ادھر حضرت علیؓ نے درخواست کی۔ اُدھر اُسی وقت حکم خدا نازل ہوا کہ علیؓ کی درخواست قبول کرلو۔ اِس واسطے رسولؐ خدا نے فوراً اقرار کرلیا۔

اِس کے بعد رسولِ خدا نے اپنے خادم انسؓ سے فرمایا۔ جاؤ ابوبکرؓ۔ عمرؓ۔ عثمانؓ طلحہؓ اور زبیرؓ کو بلا لاؤ۔ جب یہ سب لوگ آ گئے تو آپ نے خود خطبہ پڑھ کر چار سو مثقال چاندی کے مہر پر حضرت علیؓ سے حضرت فاطمہؓ کا نکاح کر دیا۔ اور نکاح کے بعد چھواروں کا ایک طباق حاضرین میں تقسیم فرمایا۔

پھر حضرت اُم ایمنؓ کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کو حضرت علی کے گھر بھیجدیا۔ اور جب حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ کے گھر میں پہنچ گئیں تو رسول خدا اُن کے گھر میں تشریف لے گئے۔ اور اپنی بیٹی فاطمہؓ سے فرمایا۔ پانی لاؤ۔ وہ اگرچہ نئی دلہن تھیں مگر فوراً اٹھ کھڑی ہو گئیں اور لکڑی کے پیالہ میں پانی لے آئیں۔ حضورؐ نے پانی کی کلی منہ میں لے کر اس پیالہ میں ڈالدی اور حضرت فاطمہؓ کے سر اور سینہ پر پیالہ کے پانی کا تھوڑا سا چھینٹا دیدیا۔ اس کے بعد فرمایا۔ پیٹھ پھیر کر کھڑی ہو جاؤ۔ وہ کھڑی ہو گئیں تو آپ نے اُن کے شانوں پر وہی پانی چھڑک دیا اور دونوں دفعہ یہی فرمایا۔ یا اللہ ان دونوں کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتا ہوں۔ اس کے بعد حضرت علیؓ سے پانی منگوایا۔ اور اُن کے چہرہ اور سینہ پر بھی پانی کا چھینٹا دیا۔ مگر اُن کی پشت پر چھینٹا نہ دیا۔ اور اُن کے لئے بھی دعا فرمائی۔ پھر کہا۔ بسم اللہ کی برکت کے ساتھ اپنے گھر میں رہو۔

حضرت فاطمہؓ کا جہیز: حضرت فاطمہؓ کو اُن کے باپ رسولِ خدا نے یہ جہیز دیا تھا

دو سوسی کی قسم کی موٹی چادریں۔ دو بچھونے جن میں السی کی چھال بھری ہوئی تھی اور چار گدے ایک کملی۔ ایک تکیہ۔ ایک چکی۔ پانی کا ایک مشکیزہ اور پانی کی ایک گھڑیا اور بعض روایتوں میں ہے کہ ایک پلنگ بھی تھا۔ زیوروں میں صرف چاندی کے دو بازوبند تھے۔

بس یہ اُس جہیز کی کائنات تھی جو دونوں جہان کے شہنشاہ نے اپنی بیٹی کو دیا۔ اور یہ کروفر تھی جو رسولؐ خدا کی پیاری بیٹی کے عقد میں ہوئی۔

ولیمہ کی دوسرے دن حضرت علیؑ نے ولیمہ کی دعوت کی۔ جس میں دس بارہ سیر وزن کی جو کی روٹیاں تھیں (حدیث میں کئی ساع آئے ہیں۔ اور ایک صاع ایک چھٹانک اور ساڑھے تین سیر کا ہوتا ہے) کچھ خرمے یعنی چھوارے یا کھجوریں تھیں۔ کچھ میدہ تھا۔ اللہ اللہ۔ یہ مولائے کائنات کے گھر کا ولیمہ تھا۔

اس سادہ شادی کی کیفیت میں یہ چند باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ منگنی میں بہت زیادہ ردوکد نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ شرطیں پیش نہیں ہوئیں۔ تیسرے یہ کہ خود دولھا نے اپنی زبان سے عرض کر دیا۔ چوتھے یہ کہ ساڑھے پندرہ سال کی عمر کو بھی حضور نے کم فرمایا۔ پانچویں یہ کہ دولھا دلہن کی عمر میں ساڑھے پانچ برس کا فرق تھا۔ جس سے ثابت ہوا کہ دولھا کو دولہن سے بڑا ہونا چاہیے۔ چھٹے یہ کہ رسولؐ خدا نے برات کی دھوم دھام زیادہ نہ کی۔ اور بہت سے لوگوں کو نہ بلایا۔ صرف پانچ چھ خاص خاص احباب کو بلا لیا۔ ساتویں یہ کہ اعلان نکاح کی ضرورت سمجھی۔ اور پانچ چھ آدمیوں کو شریک کرنا ضروری سمجھا گیا۔ آٹھویں یہ کہ جہیز میں صرف روزمرہ کی ضروری چیزیں دی گئیں۔ نام نمود اور تکلفات کی کوئی چیز نہیں دی گئی۔ نویں یہ کہ وداع میں کچھ تکلف نہ کیا گیا۔ دسویں یہ کہ حضرت فاطمہؓ سسرال میں جا کر گھونگٹ نکال کر نہ بیٹھیں۔ اور شوہر کی موجودگی میں باپ نے پانی مانگا تو خود کھڑی ہو کر پانی لے آئیں۔ اور ہندوستان کی طرح شرم سے کونے میں چھپی نہ بیٹھی رہیں گیارہویں یہ کہ ولیمہ میں زیادہ تکلفات نہیں کئے گئے۔ اور بہت اختصار کے ساتھ

سادہ کھانا پکایا گیا۔

ان تمام نتائج کو سمجھنے کے بعد ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے رسولؐ اور اپنے آقا اور ہادی کی سُنت کو سامنے رکھے اور شادیوں کے فضول تکلفات کو ضروری نہ سمجھے۔ اور اپنے نام اور عزت کو رسولؐ خدا کے نام اور عزت سے بڑھانے کا خیال نہ کرے۔ اس میں نہ بَری کا ذکر ہے نہ جوڑے کا نہ چڑھاوے کا۔ نہ اُن فضول شرائط کا جن کے سبب شادیاں کرنا ایک بڑے ملک کے فتح کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام ہو گیا ہے۔ خدا ہم سب کو سنت رسولؐ کی پیروی نصیب کرے۔

رسولؐ خدا کی سب سے پہلی بیوی حضرت خدیجہؓ کا مہر پانچ سو درم تھا۔ یا اسی قیمت کے اونٹ جو رسولؐ خدا کے چچا اور حضرت علیؓ کے والد حضرت ابوطالبؓ نے ادا کئے تھے۔

حضرت اُم سلمہؓ کا مہر ایک برتنے کی چیز تھی۔ جس کی قیمت دس درم سے زیادہ نہ تھی۔ حضرت جویریہ رضؓ کا مہر چار سو درم اور حضرت اُم حبیبہ رضؓ کا مہر چار سو دینار تھے جو حبشہ کے بادشاہ نے اپنے ذمہ رکھے تھے۔ حضرت سودہ رضؓ کا مہر چار سو درہم تھے اور ولیمہ میں حضرت اُم سلمہ رضؓ نے اپنے پاس سے جَو کا کھانا پکا کر دیا تھا۔ حضرت زینب رضؓ بنت جحش کے ولیمہ میں ایک بکری ذبح ہوئی تھی۔ اور گوشت روٹی کھلائی گئی تھی۔ حضرت صفیہ رضؓ کی شادی کے وقت صحابہ رضؓ نے اپنے پاس سے جمع کر کے ولیمہ کیا تھا۔

سب سے پیاری بیوی حضرت عائشہ رضؓ کی شادی میں ولیمہ بالکل سادہ تھا۔ یعنی نہ اونٹ ذبح ہوا نہ بکری۔ نہ کچھ اور مکلف کھانا۔ بس حضرت سعد رضؓ بن عبادہ کے گھر سے دودھ کا ایک پیالہ آیا تھا۔ وہی ولیمہ بنا کر تقسیم کر دیا گیا۔

ان حالات سے معلوم ہوا کہ حضرت خدیجہ رضؓ کا مہر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت ابوطالب رضؓ نے ادا کیا۔ اس واسطے مہر وارث بھی ادا کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ حضرت اُم سلمہ رضؓ کا مہر صرف دس درہم مقرر کیا گیا تھا تاکہ کم سے کم مہر کی مقدار معلوم ہو جائے تیسرے یہ کہ چار سو اشرفی

کا مہر بھی مقرر ہوا۔ تاکہ زاید مہر کا جواز ثابت ہو سکے۔ چوتھے یہ کہ رسول خدا کی بیویوں میں آپس کی ایسی محبت تھی کہ حضرت اُم سلمہؓ نے سوکن کی شادی کا ولیمہ اپنے پاس سے کیا۔ پانچویں یہ کہ بہت سے لوگوں کی مجموعی تعداد سے بھی ولیمہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ صحابہ نے چندہ کر کے ولیمہ کیا۔ چھٹے یہ کہ ولیمہ میں یہ ضروری نہیں کہ بڑی مقدار میں ہو۔ بلکہ جو کچھ میسر آئے وہی کھلا دینا چاہئے۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ کے ولیمہ کے وقت میں ہوا۔ حالانکہ حضرت عائشہؓ کنواری بیوی اور بہت ہی چاہیتی اور بہت ہی خوش جمال تھیں۔ خدا تعالیٰ سب مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ اپنی اپنی حالت اور بساط کے موافق شادیوں میں مہر جہیز اور ولیمہ کا بندوبست کیا کریں۔ اور حد سے بڑھ کر خرچ نہ کریں۔

یہ ۲۶؍جون ۱۹۳۷ء کی شام کو ساڑھے سات بجے دہلی ریڈیو میں خواجہ صاحب نے کی

سرسوامی انند سروپ جی کی وفات

۲۵؍جون ۱۹۳۷ء کو مدراس سے خبر آئی کہ رادھا سوامی ست سنگ کے پیشوائے اعظم سرسوامی انند سروپ صاحب جی مہاراج کا مدراس میں دل کی حرکت بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ ہندوستان کا بچہ بچہ صاحب جی مہاراج کو جانتا تھا کوئی قوم اور کوئی فرقہ ہندوستان میں ایسا نہیں ہے جس میں بےشمار مدّاح سرصاحب جی مہاراج کے نہ ہوں اُن کی عمر مرنے کی نہ تھی وہ ابھی جوان معلوم ہوتے تھے گورا رنگ تھا میانہ قد تھا۔ دُبلا بدن تھا۔ چہرہ نورانی۔ آواز نہایت شیریں اور بلند طرزِ کلام باوقار اور خود دار۔ بات کرتے وقت ہنس مکھ معلوم ہوتے تھے۔ رادھا سوامی جماعت ایک ہندو جماعت ہے لیکن یہ ایک ایسی جماعت ہے جو مذاہب کے اختلافات سے بہت اونچی ہے اس فرقے میں ہندو مسلمان عیسائی ہوسائی کا کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی یہ لوگ سب انسانوں کو محبت اور ہمدردی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ صاحب جی جب رادھا سوامی جماعت کی گدی پر بیٹھے تو رادھا سوامی فرقہ کچھ زیادہ مشہور نہ تھا۔ سرصاحب جی مہاراج نے اس فرقے کو چار چاند لگا دئے۔ انھوں نے اپنی بے مثل عملی زندگی سے رادھا سوامی جماعت کو خصوصًا ہندو صوفیوں کو بہت بلند کردیا ورنہ آج کل کے زمانہ میں ہندو اور مسلمان سادھو اور صوفی اس وجہ سے نفرت اور حقارت سے دیکھے جاتے تھے کہ وہ اپنی معیشت کا بوجھ یعنی روزی کا بوجھ مریدوں اور ماننے والوں پر ڈال لیتے تھے اور خود کچھ کام نہ کرتے تھے۔ بلکہ خود محنت سے اپنی روزی حاصل کرنا درویشی اور فقیری کے خلاف سمجھتے تھے مگر سرصاحب جی مہاراج نے اپنی روزی بھی ذاتی محنت اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ حاصل کرنی شروع کی اور دوسروں کی روزی کا بوجھ بھی خود اٹھا لیا مگر اس طرح نہیں کہ لنگر خانے جاری کردئے اور ہزاروں آدمی بیکاری اور آرام طلبی سے مفت کی روٹی کھانے لگے۔ بلکہ انھوں نے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو جن میں ہندو مسلمان اور چیلے اور غیر چیلے کی تفریق نہ تھی ہنرمند بنا دیا اور روزی سے لگا دیا۔ میں نے دیال باغ آگرہ میں اُن کے قائم کئے ہوئے کالج اور اسکول اور بہت سے کارخانے خود جاکر دیکھے تب معلوم ہوا کہ سرصاحب جی مہاراج نے بےشمار ہندوستانیوں کی روزی کا سہارا کردیا

سب سے بڑی خصوصیت میری نظر میں یہ تھی کہ اُنکی زندگی دین اور دنیا کا مجموعہ تھی اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دنیا کو مقدم رکھتے ہیں یا دین کو مقدم رکھتے ہیں کیونکہ وہ دونوں چیزوں کو ساتھ ساتھ لیکر چلتے تھے

سر صاحب جی مہاراج اپنے ہندو مذہب میں بہت پکے تھے اور میں اپنے اسلامی مذہب میں پکا تھا مگر ہم دونوں آپس میں ایکدوسرے کو بھائی کہتے تھے اور بھائی سمجھتے بھی تھے میرے بچے اپنے گھر میں سر صاحب جی مہاراج کا ذکر کرتے تھے تو اُن کو چچا کہتے تھے اور غالباً اُن کے بچے بھی ایسا ہی سمجھتے ہوں گے۔

یورپ اور امریکہ میں بھی اُنکی شخصیت اور اُنکے کاموں کی بہت دھوم تھی بڑے بڑے مشہور لکھنے والے دیال باغ میں آتے تھے اور اُنسے ملتے تھے اور اُنکے کارناموں کو دیال باغ میں دیکھتے تھے تو یورپ اور امریکہ میں جا کر اپنے اخباروں اور کتابوں کے صفحے کے صفحے تعریفوں سے بھر دیتے تھے اور غالباً ہندوستان میں مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر سر ٹیگور کے علاوہ اور کوئی بھی ایسی شخصیت نہیں ہے جس کی یورپ اور امریکہ میں اتنی تعریف ہوتی ہو۔ ابھی حال میں میرے دوست مسٹر ائیس براؤن اُن سے ملنے گئے تھے اور جب انگلستان جا کر انھوں نے ہندوستان پر کتاب لکھی تو سب سے زیادہ تعریف سر صاحب جی مہاراج کی کی تھی۔ وہ بہت منکسر المزاج تھے۔ معمولی معمولی آدمیوں کے ساتھ اکیلے اپنے کارخانے دکھانے کے لئے چلے جاتے تھے اور مہمانوں کو خود سامنے بیٹھکر کھانا کھلاتے تھے وہ صبح کے وقت چہلقدمی بھی کرتے تھے اور رات تک اُن کے سب اوقات مقررہ کاموں کے لئے تقسیم تھے اور وہ روز پچھلی رات کو بیدار ہوتے تھے اور سورج نکلنے سے پہلے تین ہزار مریدوں کی روحانی اصلاح کیلئے تقریر کرتے تھے اور اور خاص مراسم ادا کیا کرتے تھے اور ایسے ہی شام کو یعنی دونوں وقت یہ کام کرتے تھے۔ دیال باغ میں تین ہزار مرید ایسے رہتے ہیں جو ترکِ وطن کر کے دیال باغ میں آباد ہو گئے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں اُنکی شہرت اُنکی شخصیت اور بے غرض خدمت خلق کی وجہ سے تھی اور اُن کی تصنیفات کی بھی ہندوستان اور یورپ میں بہت قدر کیجاتی تھی وہ بہت سیر چشم ہندوستانی تھے ایک دفعہ کلکتہ کے ایک مرید نے پچاس ہزار روپیہ کا چک کسی نیک کام کیلئے نذر کیا سر صاحب جی مہاراج نے پوچھا اتنی بڑی رقم دیتے وقت تمہارے دل کو کچھ تکلیف تو نہیں ہوئی مرید نے جواب دیا جی ہاں کچھ تھوڑا سا خیال تو آیا کہ اتنی بڑی رقم جیب سے جا رہی ہے یہ سُن کر سر صاحب جی مہاراج نے پچاس ہزار روپیہ کا چک پھاڑ کر پھینک دیا اور فرمایا کہ جب تک دل ہر بیرونی لگاؤ سے پاک نہ ہو جائے۔ میں روپیہ نہیں لے سکتا۔

(جگہ کی کمی کے سبب یہ تقریر پوری درج نہیں ہو سکی) حسن نظامی

محرم کا چاند

یہ تقریر ۲۶ مارچ ۱۹۳۶ء ہفتہ کے دن رات کے پونے نو بجے
دہلی ریڈیو میں خود خواجہ صاحب نے سُنائی

کربلا کی بُنیادی تاریخ

مسلمانوں کا نیا سال محرم سے شروع ہوتا ہے اور وہ آپس میں نئے سال کی مُبارک باد اس واسطے نہیں دے سکتے کہ اس مہینہ کے پہلے دس دن میں اُن کے رسولؐ کے سگے نواسہ حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے بچے قتل ہوئے تھے۔ اور تعزیے اسی واقعہ کی یاد میں بنائے جاتے ہیں۔

میں اُن ہندوستانیوں کی معلومات کے لئے جو محرم کے واقعات اور ان کے اسباب کو نہیں جانتے آج اول سے آخر تک کے حالات بیان کرنے آیا ہوں۔ یہ سب باتیں معتبر تاریخوں کی ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کا مبالغہ یا طرفداری نہیں ہے۔

سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پردادا کا نام ہاشم تھا۔ اور ہاشم کے ایک سگے بھائی کا نام اُمیہ تھا۔ ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب تھے اور عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ تھے۔ اور عبداللہ کے بیٹے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ اور رسول اللہؐ کو ان کے چچا ابوطالب نے پالا تھا۔ اور ابوطالب کے بیٹے علیؑ تھے۔ جن سے رسول اللہؐ نے اپنی چھوٹی بیٹی فاطمہؑ کا نکاح کیا تھا اور علی اور فاطمہؑ سے دو لڑکے پیدا ہوئے تھے۔ بڑے کا نام حسنؑ تھا اور چھوٹے کا نام حسینؑ تھا۔

اس نسب نامہ کو سمجھنے کے بعد اب یہ سمجھیے کہ ہاشم کعبہ کے متولی تھے۔ اور ہاشم کے بھائی امیہ کو اس کا رشک تھا۔ اور وہ ہاشم کی سرداری اور عزت کو برداشت نہ کر سکتا تھا ہاشم کے بعد عبدالمطلب کعبہ کے متولی ہوئے۔ یہ بات اُمیہ کے بیٹے حرب کو ناگوار ہوئی

عبدالمطلب کے بعد اُن کے بیٹے ابوطالب حضرت علیؑ کے والد کعبہ کے متولی ہوئے تو حرب کے بیٹے ابوسفیان کو ناگوار ہوا۔

اور جب ہاشم کے پڑپوتے حضرت محمدؐ نے دعویٰ کیا کہ میں خدا کا رسول ہوں تو اُمیہ کی ساری اولاد اور امیہ کے پوتے ابوسفیان نے کھلم کھلا رسول اللہؐ کی مخالفت شروع کر دی۔ اور بدر کے میدان میں رسول اللہؐ کی اور اُمیہ کی اولاد کی لڑائی ہوئی جس میں رسول اللہؐ کے ساتھ تین سو تیرہ آدمی تھے اور اُمیہ کی اولاد کے ساتھ ایک ہزار آدمی تھے۔ رسول اللہؐ کے ساتھیوں میں ہاشم کی اولاد بھی تھی۔ اور دوسرے مسلمان بھی تھے اور اُمیہ کی فوج میں اُمیہ کی اولاد بھی تھی۔ اور دوسرے قبیلوں کے مشہور لڑنے والے بھی تھے۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اور حضرت علیؑ کے ہاتھ سے اُمیہ کی اولاد کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ مگر ابوسفیان بدر کی لڑائی میں موجود نہ تھا۔ اس لئے وہ بچ گیا۔ اور ابوسفیان اور اس کی بیوی ہندہ نے قسمیں کھائیں کہ ہم اولاد ہاشم اور محمدؐ اور علیؑ سے بدر کے مقتولوں کا بدلہ لیں گے۔ چنانچہ دوسرے سال اُحد کے میدان میں ابوسفیان ایک بڑی فوج لے کر آیا۔ اور مسلمانوں سے بدلہ لیا۔ اور رسول اللہؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کو قتل کر دیا اور ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبایا۔ اس کے بعد ابوسفیان بارہ ہزار فوج لے کر لڑنے آیا۔ اور خندق نام کی مشہور لڑائی ہوئی جس میں ابوسفیان کو شکست ہوئی۔

آخر رسول اللہؐ اور اولاد ہاشم اور دوسرے مسلمانوں نے مل کر مکہ فتح کر لیا۔ جو ابوسفیان اور اولاد اُمیہ وغیرہ کے قبضہ میں تھا۔ اور مکہ فتح ہونے کے بعد ابوسفیان اور اس کے بیٹے معاویہ مسلمان ہو گئے اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں معاویہ ملک شام کے گورنر بنائے گئے۔ اور جب حضرت علیؑ خلیفہ ہوئے تو معاویہ نے ان کی خلافت کو قبول نہیں کیا اس لئے صفین کے میدان میں علیؑ اور معاویہ کی بہت بڑی لڑائی ہوئی۔ جو صلح کی صورت میں ختم ہو گئی معاویہ کی سازش سے حضرت علیؑ قتل ہو گئے۔ اور اُن کے بڑے بیٹے حضرت حسنؑ نے

اپنی سلطنت کا حق معاویہ کو اس شرط پر دیدیا کہ معاویہ کے بعد اُن کا بیٹا یزید بادشاہ نہیں ہوگا بلکہ مسلمان جس کو چاہیں گے بادشاہ چن لیں گے۔ اس عہدنامہ کے بعد حسنؓ کو معاویہ نے ایک عورت کے ذریعہ زہر دلوایا۔ اور اُن کی شہادت کے بعد معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو عہدنامہ کے خلاف اپنا ولی عہد بنادیا۔ اور جب معاویہ نے وفات پائی تو یزید بادشاہ ہوا۔ جو اسلام کے احکام کا زیادہ پابند نہ تھا۔ اور علانیہ شراب پیتا تھا۔ حضرت حسنؑ کے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ نے یزید کی بادشاہی کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ کوفہ اور بصرہ مسلمان فوجوں کی دو بڑی چھاؤنیاں تھیں۔ اور کوفہ حضرت علیؑ کا پایہ تخت بھی تھا۔ اور کوفہ اور بصرہ میں اولاد ہاشم اور حضرت علیؓ اور حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؓ کے ماننے والے بھی بہت تھے۔ ان لوگوں نے سُنا۔ کہ حضرت حسینؑ نے یزید کی بادشاہی قبول نہیں کی۔ تو اُنھوں نے مدینہ میں حضرت حسینؑ کو خط لکھے۔ کہ آپ یہاں آجایئے ہم سب آپ کی حمایت میں یزید سے جنگ کریں گے۔

حضرت حسینؑ نے اپنے چچازاد بھائی مسلمؑ کو حالات معلوم کرنے کے لیئے کوفہ بھیجا مسلمؑ نے حضرت حسینؑ کو اطلاع دی۔ کہ چالیس ہزار کوفیوں نے میرے ہاتھ پہ عہد کیا ہے۔ کہ حسینؑ کا ساتھ دیں گے۔ حضرت حسینؑ اپنے بیوی بچوں اور ۷۲ ساتھیوں کو لے کر کوفہ گئے۔ راستہ میں ان کو خبر ملی کہ کوفہ والے یزید کے گورنر ابن زیاد سے مل گئے ہیں۔ اور اُنھوں نے مسلمؑ کو قتل کردیا ہے اور اُن کے دو معصوم بچوں کو بھی مار ڈالا ہے۔ اور جب حضرت حسینؑ کوفہ کے قریب کربلا نامی مقام پر پہنچے تو ابن زیاد کی فوجوں نے اُن کو گھیر لیا۔ اور حضرت حسینؑ کو مجبور کیا کہ وہ یزید کی بادشاہی کو قبول کرلیں۔ حضرت حسینؓ نے جواب دیا۔ میں لڑنا نہیں چاہتا۔ میرے بھائی نے بھی مسلمانوں کو خانہ جنگی سے بچانے کے لیئے معاویہ کو بادشاہی دے دی تھی۔ میں بھی دیدیتا مگر یزید عہدنامہ کے خلاف مسلمانوں کے انتخاب سے بادشاہ نہیں ہوا بلکہ زبردستی بادشاہ بنا ہے۔ اور اس کے اعمال بھی اسلام کے خلاف ہیں۔ اس واسطے نہ اُس کی اطاعت کروں گا نہ اس سے لڑوں گا۔ بلکہ مدینہ میں جاکر خاموش بیٹھ جاؤں گا۔ ابن زیاد کی فوج نہ مانی اور

اُس نے حضرت حسینؓ کا پانی بند کر دیا۔ اور محرم کی دس تاریخ کو حضرت حسینؓ اور اُن کے سب بچے اور ساتھی بڑی بے رحمی سے قتل کر دیئے گئے۔ اور لاشیں گھوڑوں سے روندی گئیں عورتوں کے خیمے لوٹے گئے اور جلائے گئے۔ اور اُن کے ہاتھوں میں رسیاں باندھ کر اونٹوں پر سوار کیا گیا۔ اور بڑی ذلت اور ایذا کے ساتھ یزید کے پایہ تخت دمشق میں بھیجا گیا۔

یزید نے دربار میں حضرت حسینؓ کا سر دیکھ کر کہا کہ آج بدر کی لڑائی کا بدلہ پورا ہوا۔ یعنی بدر کی لڑائی میں اولاد اُمیہ کے جو سردار حضرت علیؓ کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے۔ اُن کا انتقام اُمیہ کی اولاد نے ہاشم کی اولاد سے لے لیا۔

حضرت حسینؓ کے صرف ایک بیمار بیٹے زین العابدینؓ زندہ بچے تھے۔ انہی سے حضرت علیؓ کی اولاد چلی جو آج کل سید کہلاتی ہے اور اسی واقعہ کربلا کی یاد محرم میں منائی جاتی ہے۔

یہ تو مختصر تاریخی بیان تھا جس سے محرم اور کربلا کے غم اور اس کے اسباب معلوم ہوئے اب میں چند غم ناک واقعات کی تفصیل بیان کرتا ہوں۔ جن سے بنی امیہ یعنی اولاد امیہ کی سفاکی اور بے رحمی اور بنی ہاشم یعنی اولاد ہاشم کی مظلومیت ظاہر ہوتی ہے۔

مگر پہلے یہ بتا نا ضرور ی ہے۔ کہ شیعہ سُنی کا اختلاف حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے سبب نہیں ہے۔ بلکہ اس کی بُنیاد دوسری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ اور اُن کے بعد حضرت عمرؓ اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ اور ان کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تھے۔ شیعہ فرقہ کا عقیدہ ہے کہ خلافت کا حق حضرت علیؓ کا تھا۔ کیونکہ وہ رسول اللہؐ کے بھائی تھے اور داماد تھے۔ اور رسولؐ اللہ نے آخری حج کے بعد ایک لاکھ مسلمانوں کے سامنے تقریر کی تھی۔ جس میں فرمایا تھا۔ کہ "جس کا میں آقا ہوں اس کے علیؓ بھی آقا ہیں" شیعہ کہتے ہیں رسولؐ اللہ کے اس ارشاد میں یہ اشارہ تھا۔ کہ میرے بعد علیؓ خلیفہ ہونگے اس لئے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ برحق خلیفہ نہ تھے سُنی کہتے ہیں چونکہ مسلمانوں کی عام رائے سے ان تینوں کا انتخاب ہوا تھا اس واسطے وہ برحق خلیفہ تھے اور

رسول اللہ نے کوئی صاف حکم حضرت علیؑ کی خلافت اور جانشینی کا نہیں دیا تھا۔

محرم اور واقعۂ کربلا کے ادب اور غم والم میں شیعہ سُنی کا کچھ اختلاف نہیں ہے۔ دونوں فرقے بلکہ مسلمانوں کے سب فرقے حضرت امام حسینؑ اور ان کے بچوں اور ساتھیوں کی غمناک شہادت کی یاد میں شریک ہوتے ہیں۔ اور تمام اسلامی دُنیا میں اس دردناک واقعہ کی یاد منائی جاتی ہے۔ تعزیے کے جلوس نکلتے ہیں مجلسوں میں واقعات کربلا کو بیان کیا جاتا ہے۔ اور نظم مرثیے پڑھے جاتے ہیں اور شیعہ فرقہ کے عورت مرد ماتم بھی کرتے ہیں

تعزیہ عربی لفظ ہے۔ اس کے معنیٰ ماتم پرسی کے ہیں۔ ہندوستان کے ہر شہر میں تعزیہ کے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ ہزاروں ہندو بھی تعزیئے بناتے ہیں۔ اور لاکھوں ہندو تعزیوں کے جلوس میں اور نذر نیاز میں شریک ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی ہندو ریاستوں میں لاکھوں روپے کے خرچ سے محرم کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔

واقعہ کربلا کے اشخاص) کربلا کے واقعہ کے بیان میں حسب ذیل اشخاص کے نام بہت آتے ہیں۔ لہٰذا ان کا تعارف ضروری ہے کیونکہ اکثر ہندوستانی واقف نہیں ہیں کہ یہ کون تھے

(۱) حضرت امام حسینؑ رسول اللہ کے نواسہ (۲) حضرت علی اکبر حضرت امام حسینؑ کے اٹھارہ سالہ بیٹے (۳) حضرت علی اصغر امام حسینؑ کے دودھ پیتے بیٹے (۴) حضرت عباسؑ حضرت امام حسینؑ کے بھائی (۵) حضرت سکینہ امام حسینؑ کی چھوٹی لڑکی (۶) حضرت شہربانو حضرت امام حسینؑ کی بیوی جو شاہ ایران کی بیٹی تھیں (۷) حضرت زینب امام حسینؑ کی بہن (۸) حضرت صغریٰ امام حسینؑ کی بیمار لڑکی جو سفر کربلا میں ساتھ تھیں (۹) دُلدُل امام حسینؑ کا گھوڑا (۱۰) شیریں امام حسینؑ کی لونڈی (۱۱) حُر یزیدی فوج کا ایک افسر جو امام حسینؑ کی حمایت میں قتل ہوا۔ (۱۲) خولی بن یزید امام حسینؑ کا قاتل (۱۳) عمر بن سعد یزیدی فوج کا کمانڈر جو سعد بن وقاص فاتح ایران کا بیٹا تھا (۱۴) ابن زیاد کوفہ کا یزیدی گورنر (۱۵) یزید جو معاویہ گورنر شام کا بیٹا اور ابوسفیان کا پوتا اور حرب کا پڑپوتا تھا۔ اور جس کے حکم سے امام حسین اور ان کے بچوں اور ساتھیوں کو قتل کیا گیا تھا۔

یزید کی حکومت میں اتنے ملک تھے پورا حجاز یعنی ملک عرب یمن سمیت اور پورا ملک شام وفلسطین اور پورا مصر اور عراق اور پورا ایران و افغانستان اور وسط ایشیا کے بعض حصے کربلا ملک عراق میں ہے جس کو مسوپوٹیمیا کہتے ہیں۔ یہ مقام بغداد کے قریب ہے۔ فرات دریا کے کنارہ یہ مقام ہے۔ عراق میں گرمی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور واقعہ کربلا تیز گرمی کے زمانہ میں ہوا تھا۔ یزیدی فوج نے امام حسینؑ کا محاصرہ کر کے کھانا پانی بند کر دیا تھا۔ اور فرات دریا پر پہرے لگا دئے تھے۔ امام حسینؑ اور ان کے بچوں اور عورتوں کو عراق کی تیز گرمی میں کئی وقت پانی نہ ملا۔ اور ان کے لڑکے اور بھائی اور ساتھی اسی پیاس کی حالت میں لڑے اور قتل ہوئے۔ امام حسینؑ کے ڈیڑھ سالہ بچے علی اصغر کو ایک یزیدی سپاہی نے باپ کی گود میں دیکھا تو اس نے بچے کے تیر مارا۔ جو علی اصغر کے حلق میں لگا۔ جس کے صدمہ سے بچہ باپ کی گود میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ حضرت عباسؓ مشک لے کر دریا پر پانی لینے گئے۔ اور دشمن سے مقابلہ کر کے مشک میں پانی بھر لیا۔ مگر دشمن نے ان کو قتل کر دیا۔ یزیدی فوج کے سپاہیوں کو ڈیڑھ سیر جو روزانہ ملتے تھے یہی ان کی تنخواہ تھی۔ یزیدی فوج کے سب سپاہی مسلمان تھے۔ اور پانچوں وقت نماز پڑھتے تھے۔ اور ہر نماز میں رسول اللہؐ کی اولاد پر سلام پڑھتے تھے۔ کیونکہ ہر مسلمان عورت مرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ رسول اللہؐ کی آل اولاد پر درود سلام بھیجے۔ مگر یزیدی فوج کے دل ایسے سخت تھے۔ کہ آل رسولؐ پر نماز میں سلام بھیجتے تھے۔ اور میدان میں آکر ان کے سینوں پر برچھیاں چلاتے تھے اور تلواروں سے ان کے سر کاٹتے تھے۔ ان میں بہت سے سپاہی اور افسر ایسے تھے جنہوں نے رسول اللہؐ کو دیکھا تھا۔ اور یہ بھی دیکھا تھا کہ رسول اللہؐ اپنے پیارے نواسے حسینؑ کو اپنے کندھے پر بٹھاتے تھے۔ اور حسینؑ کے منہ میں اپنی زبان ڈالتے تھے۔ اور ان کا منہ چومتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ جو مجھ سے محبت رکھنی چاہتا ہے اس کو حسنؑ اور حسینؑ اور ان کے ماں باپ سے بھی محبت کرنی چاہئے۔

محرم کی دسویں تاریخ کو کربلا کے میدان میں یہ لڑائی ہوئی اور سورج چھپنے سے پہلے حضرت امام حسینؑ اور ان کے سب بچے اور ساتھی جو ۷۲ آدمی تھے قتل ہوگئے۔ مگر امام حسینؑ نے آخر وقت تک یزید کی اطاعت اور بادشاہی قبول کرنے سے اس بنا پر انکار کیا کہ یزید اسلامی اصول جمہوریت کی موافق عام انتخاب سے بادشاہ نہیں ہوا اور اس کا چال چلن اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔

درحقیقت اس کو لڑائی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ۷۲ آدمیوں پر ہزاروں ہتھیار بند قواعد داں فوج نے حملہ کیا تھا۔ اور وہ ۷۲ آدمی بھوک پیاس سے ادھ موئے ہو چکے تھے۔

محرم کے چاند کو دیکھ کر آج میرے دل پر کیا اثر ہو رہا ہے اور میں خیالات کی دنیا میں اپنے دل سے خیالی زبان میں کیا باتیں کر رہا ہوں۔ اس کو ریڈیو کے سننے والے بھی سننا چاہیں تو سنیں۔ سناتا ہوں۔

ارے او آسمان سے جھانکنے والے چاند سے ٹکڑے تو آج اداس اداس کیوں معلوم ہوتا ہے۔ تیرا نام تو چاند ہے۔ ہر پیاری شکل کو تجھ سے مشابہت دی جاتی ہے۔ تو عید کی چاند رات کو ہر عورت مرد چھوٹے بڑے مسلمان کو پیارا معلوم ہوا کرتا ہے۔ اور سب تجھ کو دیکھنے گھروں سے باہر آجاتے ہیں۔ آج بھی تو ویسا ہی چھوٹا سا ہے۔ اور چمک دمک بھی ویسی ہے لیکن ذرا غمگین نظر آتا ہے۔ تیری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔

پیارے چندا ذرا منہ سے بول۔ دل کی لگی سنا۔ تیرا کیا حال ہے۔ تو کیوں افسردہ ہے اور کیوں نڈھال ہے۔ دیکھ میں ہوں حسن نظامی، دلی والا حسینؑ شہید کربلا کی اولاد۔ اور تو محرم کا چاند ہے۔ وہ محرم جو ہجری سال کا پہلا مہینہ ہے۔ تو نے آج طلوع ہو کر آسمان کے کنارہ پر چمک کر سب کو بتا دیا کہ ۱۳۵۴ھ ختم ہوا اور ۱۳۵۵ھ شروع ہوگیا۔ تو یہ بھی کہتا ہے کہ حسن نظامی آج ستاون برس کا ہو گیا۔ کیونکہ وہ دوسری محرم کو پیدا ہوا تھا۔

کیا تجھ کو وہ وقت یاد آ رہا ہے۔ جب حسینؑ شہید کربلا اپنے نانا محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کے مزار پر آخری سلام کرنے گئے۔ اور انھوں نے نانا کی قبر مبارک کو دیکھ کر کہا۔ بابا میں آپ کا لاڈلا حسینؑ ہوں۔ جس کا منہ چوما کرتے تھے۔ اور جس کو گود میں لے کر پھرا کرتے تھے۔ اور جس کی ماں فاطمہؑ کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک فرمایا کرتے تھے۔ بابا میں اپنی فاطمہؑ کا چھوٹا بیٹا ہوں۔ جو آپ کی چھوٹی بیٹی تھیں۔ اور جن سے آپ کو سب سے زیادہ محبت تھی اور جنہوں نے اپنے ہاتھ آپ کو دکھائے تھے۔ کہ بابا گھر کی چکی پیستے پیستے دیکھو میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ مجھے کوئی لونڈی عنایت کیجئے۔ جو گھر کے کام میں میرا ہاتھ بٹائے تو آپ نے فرمایا تھا بیٹی تو میری لخت جگر اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ میں بھی دوسروں کی خدمت کے لئے خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔ اور رات دن محنت کرتا ہوں۔ تو بھی اپنا کام دوسروں پر نہ ڈال اور اپنے ہاتھ سے سب کام کر۔

بابا آپ دنیا سے خدا کے پاس تشریف لے گئے تو چھ مہینہ کے بعد آپ کی بیٹی فاطمہؑ میری ماں بھی دنیا سے بیزار ہو کر رخصت ہو گئیں۔ پھر میرے باپ علیؑ شیر خدا کو بھی شہید کر دیا گیا۔ پھر میرے بڑے بھائی حسنؑ بھی زہر دے کر ختم کر دئے گئے۔ اب مجھے امیہ کی اولاد نے گھیرا ہے۔ معاویہ کا بیٹا یزید تخت پر بیٹھا ہے اور کہتا ہے۔ کہ میں اس کی اطاعت کا حلف اٹھاؤں۔ ورنہ وہ میری زندگی ختم کر دے گا۔ مجھے مدینہ میں بھی چین نہیں دیتے۔ مکہ جاتا ہوں تو وہاں بھی ستاتے ہیں۔ میں حکومت نہیں چاہتا۔ مگر نااہل کی محکومیت بھی نہیں چاہتا مجھے میرے باپ کے پایۂ تخت کوفہ میں بلایا جاتا ہے۔ میں وہاں جا رہا ہوں اور مجبوراً جا رہا ہوں

لے محرم کے چاند کہا تو حسینؑ شہید کربلا کی بیمار بیٹی فاطمہ صغریٰ کے خیال سے غمگین ہے جب کہ اس کو اس کے باپ نے کربلا کے سفر میں بیماری کے سبب ساتھ نہ لیا تھا۔ اور وہ اپنی نانی ام سلمہ کے پاس رہتی تھیں اور روز دروازہ پر آ کر مسافروں سے اپنے باپ کا حال پوچھتی تھی۔ اور کہتی تھی کہ کوئی کوفہ جانے والا ہو تو میرے بابا سے کہہ دے کہ آپ کی بیٹی آپ کو یاد کرتی ہے۔ مجھے اماں یاد آتی ہیں۔ بھائی علی اکبر یاد آتے ہیں۔ اور بہن سکینہ یاد آتی

ہے اور بھورے بھورے لمبے لمبے بالوں والہ ننھا سا بھائی علی اصغر یاد آتا ہے جس کو میں گود میں لے کر جی بہلایا کرتی تھی۔ بابا میرے سب بہن بھائی ماں باپ کے پاس ہیں بس میں ایک اکیلی یہاں رہ گئی ہوں۔ اے قاصد کہہ دیجیو جب عراق کی طرف سے خاک اُڑتی دکھائی دیتی ہے تو مجھے یہی خیال آتا ہے کہ میرے بابا آ گئے۔ میرے چچا عباسؓ آ گئے۔ میرے بھائی علی اکبر آ گئے۔ میری بہن سکینہ بھی آ گئی۔ اور میرا ننا بھائی علی اصغر بھی آ گیا۔ مگر کوئی نہیں آتا۔ میں دروازہ پر سارا سارا دن کھڑی راہ دیکھا کرتی ہوں۔

اے محرم کے چاند شاید تجھ کو کربلا کا میدان یاد آ گیا جو تو آج کچھ چپ چپ سا معلوم ہوتا ہے۔ تو خیال کرتا ہو گا کہ حسینؑ ابن رسولؐ اللہ نے عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لئے خندق کھود دی تھی۔ اور اس میں آگ جلائی تھی۔ اور موسم بھی گرمی کا تھا اور دشمن نے پانی بھی بند کر دیا تھا۔ اور رسولؐ کے گھر والے عورت مرد اور بچے پیاس سے بلبلا رہے تھے۔ ان کے حلق سوکھ گئے تھے۔ اور شہنشاہ ایران کی بیٹی شہربانو اپنے شوہر حسینؑ سے کہتی تھیں کہ میرے معصوم بچہ علی اصغر کو تو پانی منگا دو۔ دشمن سے کہو کہ ہمیں پانی نہ دیں اِن کے گنہگار ہیں۔ اس بچہ نے کیا گناہ کیا ہے جو اس کا پانی بھی بند کیا ہے اور حسینؑ کہتے تھے کہ میری غیرت دشمن سے التجا کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ میں اس بچہ کو گود میں لے جاتا ہوں اگر اس کو دیکھ کر دشمنوں کو خود خیال آگیا اور پانی دیدیا تو خیر ورنہ میں اپنی زبان سے پانی نہ مانگوں گا۔ اور جب حسینؑ خیمہ کے باہر آئے اور بچہ ان کی گود میں دشمن کی فوج نے دیکھا۔ تو ایک سفاک یزیدی سپاہی نے تیر چلایا۔ جو امام حسینؑ کے بازو کو چھید کر علی اصغر کے حلق کے پار ہو گیا۔ اور بچہ باپ کی گود میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اور حسینؑ بچہ کی لاش کو گھر میں لائے اور اس کی ماں کو وہ لاش دیدی اور کہا لو۔ تمہارا بچہ موت کا پانی پی کر آیا ہے۔ یہ مجھ سے پہلے بہشت میں چلا گیا۔ اور پھر امام حسینؑ نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا اور کہا۔ اے خدا تو گواہ رہیو۔ کہ حسینؑ اس امتحان میں پورا اترا ہے اور اس کے ارادہ میں کچھ بھی فرق نہیں آیا ہے۔

اے محرم کے چاند کیا تجھ کو علی اکبرؑ کا مرنا یاد آرہا ہے۔ جب باپ نے اُن کو اپنے ہاتھ سے ہتھیار پہنائے۔ اور مقابلہ کے لئے میدان میں بھیجا۔ اور علی اکبر نے چھاتی پر برچھی کھائی اور شہید ہو گئے کیا تو حسینؑ کے بھائی عباسؑ کے غم میں رو رہا ہے جب کہ اُنھوں نے پانی کی مشک دونوں ہاتھ کٹ جانے کے بعد دانتوں سے پکڑ کر اٹھائی تھی۔ اور کہا تھا کہ میں اپنے بھائی کی معصوم لڑکی سکینہ کے لئے پانی ضرور لے کر جاؤں گا۔

رنجیدہ چاند تجھ کو حسینؑ کا وہ وقت یاد آرہا ہوگا۔ جب کہ اُن کے سب بچے اور سب قرابت دار اور سب ساتھی ایک ایک کر کے کٹ گئے۔ اور حسینؑ اکیلے رہ گئے۔ اور اپنی عورتوں سے رخصت ہونے گئے۔ اور اُن کے بیمار لڑکے عابدؑ نے کہا مجھے تلوار دو۔ میں بھی باپ کی بات پر قربان ہونا چاہتا ہوں اُنکی پھپھی زینب اور ماں نے روک لیا۔ اور باپ نے کہا۔ بیٹیا اب بس تو ایک باقی رہ گیا ہے۔ جو علیؑ اور فاطمہؑ کے گھر کی نشانی ہے۔ تو بھی مر جائے گا۔ تو یہ نسل ہی ختم ہو جائے گی اس کے بعد سکینہ کو پیار کیا اور کہا بیٹی اب تم قیدی بنائی جاؤ گی۔ صبر و ہمت سے کام لینا۔ پھر بہن کو اور بیوی کو صبر کی تلقین فرمائی اور میدان میں آکر لڑے اور ایسے لڑے کہ ستر زخم کھائے۔ آخر گھوڑے سے گرے اور خولی بن یزید نے اُن کے سینہ پر گھٹنے رکھ کر سر کاٹ لیا۔ اور سب شہیدوں کی لاشوں پر گھوڑے دوڑائے۔ پھر امام حسینؑ کے خیمہ کو لوٹا اور جلایا۔ عورتوں کے سروں سے چادریں اُتار لیں۔ اور اُن کے ہاتھوں میں رسیاں باندھی گئیں۔ اور اُن کو اونٹوں پر ننگے سر بٹھایا گیا۔ اور امام حسینؑ کی لڑکی سکینہ کے طمانچے مارے گئے۔ اور ان قیدیوں کو کربلا سے ملک شام کے شہر دمشق میں لے گئے۔ آگے آگے مقتولوں کے کٹے ہوئے سر تھے۔ جن کو برچھیوں کی نوکوں پر چڑھایا گیا تھا۔ اور پیچھے پیچھے امام حسینؑ کی عورتیں اور بچے تھے اور راستہ کے شہروں میں ہزاروں آدمی ان قیدیوں کو دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔

اے محرم کے چاند تو نے اس زمین کے بے شمار خونی تماشے دیکھے ہوں گے۔ مگر سچ بتا کہ کیا حسینؑ شہید کربلا سے زیادہ غمناک واقعہ بھی تو نے کبھی دیکھا ہے؟ یقیناً آج تو اسی لئے اداس

اور رنجیدہ ہے۔ کہ تجھ کو کربلا کا دن اور کوفیوں اور یزیدیوں کے ظلم یاد آرہے ہیں۔ تو گواہ رہیو
کہ میں حسینؑ کی اولاد ہوں اور میرے جسم میں اس جوان مرد کا خون ہے تو میں بھی صبر و ہمت
سے کام لوں گا اور دنیا کے کسی ظالم اور بے حق و نا اہل آدمی کے آگے اپنے حق پرست سر کو نہ جھکنے دوں گا

سکینہ کی پیاس

دیکھو وہ سامنے اپنی ماں کے پاس امام حسینؑ کی چھوٹی لڑکی سکینہ کھڑی
ہیں۔ محرم کی دسویں تاریخ ہے۔ سکینہ کے بڑے بھائی علیؑ اکبر قتل ہو چکے ہیں۔ چھوٹے بھائی علی اصغر
کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش سکینہؑ کے بابا گود میں لے کر خیمہ میں آئے ہیں اور سکینہ کی ماں اپنے
دودھ پیتے بچہ کی لاش باپ کی گود سے لے کر چھاتی سے لگا رہی ہیں۔ اور رو رو کر کہہ رہی ہیں۔
کیوں بیٹا پانی پی لیا؟ میرے لال تم تو سو گئے۔ تم نے آنکھیں بند کر لیں۔ تم اپنی ماں سے روٹھ
گئے۔ دیکھوں تمہارے نازک حلق میں تیر کہاں لگا؟ لو اپنی بہن سکینہ کی گود میں جاؤ جس سے
بہت مانوس تھے۔ لو سکینہ اپنے ننھے بھائی کو لو۔ یہ بہت پیاسے تھے انھوں نے موت
کے پانی کا ٹھنڈا گھونٹ پیا ہے اور کیسے بے خبر سوتے ہیں۔

سکینہ نے بھائی کی لاش کو گود میں لے لیا۔ سکینہ کو خبر نہ تھی کہ بھائی مر گیا ہے۔ انہوں نے
بھائی کے گلے اور کرتہ کو خون میں بھرا دیکھا تو گھبرا کر کہا۔ امّی یہ خون کیسا ہے؟ ماں نے کہا یہ خون تمہارے
باپ کا ہے۔ اور تمہارے نانا محمد رسول اللہ کا ہے اور تمہارے دادا علیؑ مشکل کشا کا ہے۔ یہ
خون ظلم و ستم کے تیر نے بہایا ہے۔ یہ خون یزید کی بے رحم فوج نے دکھایا ہے۔ تمہارا بھائی مر
گیا۔ اس کو ظالموں نے مار ڈالا۔ یہ پانی کی ایک ایک بوند سے ترستا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ کہہ کر
بچہ کی لاش سکینہ سے لے لی اور جھولے میں لٹا دی اور دونوں ہاتھ مل کر کہا۔ ایک کڑیل جوان بیٹا
میدان میں مارا گیا۔ ایک کونپل یہ سامنے مرجھائی ہوئی پڑی ہے۔ میری گود خالی ہو گئی۔ مجھے
دشمنوں نے لوٹ لیا۔ میرے روشن گھر میں اندھیرا کر دیا۔ قیامت آجائے تو عرش کا پایہ پکڑ
کر خدا سے فریاد کروں گی کہ میرے بچوں کو مار ڈالا۔ سکینہ نے ماں کی باتیں سنتے سنتے کہا۔ امّی
دیکھو میری زبان۔ پیاس سے کانٹے پڑ گئے ہیں۔ حلق میں بھی کانٹے ہیں۔ مجھے پانی منگا دو۔ دریا

پاس ہے۔ بابا سے کہدو کہ وہ پانی لادیں یا کسی کو بھیجکر منگادیں۔

ماں نے جواب دیا۔ پیاری دریا فاطمہؑ کی اولاد کے لئے سوکھ گیا۔ یزید کے گھوڑے، گدھے اور کتے اس کا پانی پیتے ہیں۔ فرات کی لہریں یزید کی فوج پر مہر کرتی ہیں۔ ہم آلِ رسولؐ ہیں ہمارے لئے اس کا پانی بند ہے اور ہم اس کی ایک ایک بوند سے محروم ہیں۔ سکینہ نے ماں کی بات کو نہ سمجھا اور ماں کی چادر پکڑ کر کہا۔ ہمیں پیاس لگی ہے ہم نے کئی دن سے پانی نہیں پیا۔ ہمیں پانی منگادو۔ بابا کہتے تھے آل رسولؐ کو خدا نے حوض کوثر دیا ہے تو اسی کا پانی منگادو۔ کیا وہ حوض یہاں سے دور ہے؟ کیا اس پہ بھی یزید اور شمر نے پہرے لگادئے ہیں؟ کیا وہ بھی ان کے قبضہ میں چلا گیا ہے؟ وہ تو ہمارے بابا کا تھا۔ کیا وہ بھی شمر نے چھین لیا؟

میں نے کہا بیٹی حوض کوثر آسمان پر ہے۔ تمہارے بھائی علیؑ اکبر اور علی اصغرؑ پانی لینے گئے ہیں۔ سکینہ نے کہا بھائی علی اصغرؑ کہاں گئے وہ تو سوتے ہیں۔ بھائی علی اکبر بھی لڑنے گئے ہیں حوض کوثر پہ تو کوئی بھی نہیں گیا۔ مجھے تو پیاس لگ رہی ہے اماں جان میں سچ کہتی ہوں مجھے بہت پیاس ہے میں تو مدینہ میں سب کو ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پلایا کرتی تھی۔ آج مجھے کوئی بھی پانی نہیں دیتا۔ اب میں مدینہ جاؤں گی تو بہن صغریٰ سے کہوں گی کہ مجھے کربلا میں کسی نے پانی نہیں دیا تھا تم بھی کسی کو پانی نہ دو۔ اور میں بھی شمر کی بیٹی کو پانی نہیں دوں گی۔

سکینہ کی باتیں سن کر اُن کی پھپی زینب نے سکینہ کو گود میں اُٹھالیا اور کہا میری بیٹی بڑی صبر والی ہے ابھی اپنی بیٹی کو پانی منگادوں گی۔ چچا عباسؑ مشک لے کر دریا پر گئے ہیں۔ پانی لاتے ہوں گے خوب پینا اور ہم کو بھی دینا۔ ہم نے بھی کئی دن سے پانی نہیں پیا۔ سکینہ نے کہا آپ تو بڑی ہیں اور ہم بچے ہیں۔ پہلے ہم کو پانی منگادو۔ ہم پی لیں پھر آپ کو بھی دیں گے ہم تو مدینہ میں آپ کو بھی پانی پلایا کرتے تھے۔ کیا ہوا چچا عباسؑ اب تک نہیں آئے؟ خبر نہیں اتنی دیر کیوں لگائی کیا ان کو بھی دشمنوں نے مار ڈالا؟ پھپی پیاس لگی ہے۔ اُمّی تمہاری سکینہ پیاسی ہے۔ پانی۔ ہائے پانی۔ دم آنکھوں میں آگیا۔ پانی۔ یہ کہتے کہتے غش کھا کر گر پڑیں۔

کربلا کی باتیں سُنتی ہو گنگا جی۔ میں ہوں فرات۔ عراق کا مشہور دریا۔ میں ہندوستان کی گنگا جی سے کربلا کی باتیں کرنی چاہتا ہوں۔ کیا اچھا ہو کہ تمہاری بہن جمنا بھی ہوں۔ تو اپنے کنارہ کی ایک دکھ بھری کہانی سُناؤں۔ گنگا جی نے جواب میں کہا:۔

کیا کہتے ہو بھائی فرات۔ میں گنگا ہوں اپنی بہن جمنا جی سے ملی ہوئی۔ الہ آباد سے جواب دے رہی ہوں۔ میں تم کو جانتی ہوں میرے اور میری بہن جمنا کے کنارہ سیکڑوں برس سے تمہارا نام مرثیوں میں لیا جاتا ہے۔ سناؤ وہ کیا داستان ہے؟ کس کے دُکھ کی بپتا ہے؟ فرات نے جواب دیا۔

بہن! آج سے کچھ کم چودہ سو برس پہلے کا ذکر ہے۔ عرب ملک کے مشہور رسول حضرت محمدؐ کے نواسہ حسینؑ اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ میرے کنارہ پر آکر ٹھہرے۔ یہ حسینؑ اپنے باپ علیؑ کے زمانہ میں جب کہ شہر کوفہ میں ان کا پایہ تخت تھا۔ اور وہ ایک تہائی دُنیا پر وہاں بیٹھ کر حکومت کرتے تھے۔ میرے کنارہ گھوڑے دوڑانے آیا کرتے تھے۔ بڑی سُندر صورت تھی۔ لمبے لمبے بال کندھوں پر پڑے رہتے تھے۔ عراق کے لاکھوں عورت مرد اُنکے آگے جُھک جاتے تھے۔ جب ان کو دیکھتے تھے مگر جب کا قصہ میں کہہ رہا ہوں۔ اس وقت وہ آئے تو ان کی اور ان کے باپ کی بادشاہی پر یزید نامی ایک انیائی اور ظالم راجہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ یزید کی فوج کا سیناپتی عمر سعد تھا۔ اور اُس نے حسینؑ کو گھیر لیا اور میرے کناروں پر پہرے لگا دئے کہ فرات کے پانی کی ایک بوند حسینؑ اور اُن کے بچوں اور عورتوں کو نہ ملے۔ اُس زمانہ میں بڑی گرمی تھی۔ اور میرے کنارہ کی زمین کا ریتا بھاڑ کی بھوبل کی طرح تپتا تھا۔ اور حسینؑ کی عورتیں اور بچے کئی دن کی پیاس سے تڑپ رہے تھے۔ وہ سب میرے کنارہ پر تھے اور میرے بہتے پانی کو دیکھ سکتے تھے اور میں ان کے سوکھے ہونٹوں اور پیاسی شکلوں کو دیکھ سکتا تھا۔ حسینؑ کے بھائی عباسؑ مشک لے کر لڑتے بھڑتے میرے اندر آ گئے اور انہوں نے پانی بھر لیا۔ اور دونوں ہاتھوں میں پانی لے کر پینا چاہا۔ مگر کچھ سوچ کر بولے۔ میرے بھائی پیاسے ہیں۔ میرے بھائی کی عورتیں پیاسی ہیں میرے بھائی کے چھوٹے چھوٹے بچے پیاسے ہیں اور سکینہ بھی پیاسی ہے۔ میرے بھائی حسینؑ کی چھوٹی لڑکی جس نے مجھے پانی لینے بھیجا ہے۔ میں

اُن پیاسوں سے پہلے کیوں کر پانی پیوں۔ یہ بڑی بے مروتی کی بات ہے یہ کہہ کر عباسؑ نے پانی ہاتھ سے پھینک دیا اور مشک لے کر چلے دشمنوں نے تیر برسانے شروع کئے اُن کی مشک چھلنی ہوگئی پانی بہنے لگا۔ پھر اُن کے دونوں ہاتھ کٹ گئے اور مشک گر پڑی تو اُنھوں نے دانتوں سے مشک کو اُٹھا لیا۔ بہنوں یہ آدمی بڑا بہادر معلوم ہوتا تھا۔ مگر میرے ہی کنارہ مارا گیا۔ اور اُس کے بھائی حسینؑ گھوڑا دوڑا کر آئے اور اپنے مرنے والے بھائی کی لاش اُٹھا کر لے گئے۔

بہن گنگا۔ اور بہن جمنا۔ ہم تم کو ہر وقت بہنا پڑتا ہے۔ اور ہم سب نے اپنے اپنے کناروں پہ بڑے بڑے دُکھ دینے والے کام دیکھے ہیں۔ مگر جیسا دُکھ بھرا قصہ میں نے اپنے کنارہ دیکھا۔ ایسا قصہ دُنیا کے کسی دریا نے نہ دیکھا ہوگا۔ جب حسینؑ اور اُن کے سب بچے اور سب ساتھی ایک ایک کر کے قتل ہو گئے۔ تو یزیدی فوج نے بڑی بے رحمی سے عورتوں کے خیموں کو لوٹا۔ اور پردہ والی عورتوں کے سروں سے چادریں بھی چھین لیں۔ اور ان کے بچوں کو بھی مارا۔ اور ستایا۔ اور اُن کے خیموں میں آگ بھی لگائی۔ تم خیال کرو گے کہ یزیدی فوج کو ایسے بُرے کام کے لئے بڑی دولت یزید نے دی ہوگی۔ نہیں بہنوں یہ بات نہ تھی۔ اُن کو تو فقط ڈیڑھ سیر چَنے فی آدمی روزانہ ملتے تھے۔

گنگا جی نے جواب دیا۔ بھائی فرات تمہاری کہانی سُن کر ہم دونوں کو بہت دُکھ ہوا۔ ہمارے دیش میں بھی جمنا کے کنارہ راجہ کنس نے بڑے بڑے ظُلم کئے تھے مگر ایسا ظُلم جس کا تم نے حال بیان کیا راجہ کنس نے بھی نہیں کیا۔ اُس نے اپنی بہن کے بچوں کو راج چھین لینے کے ڈر سے مارا تھا۔ پر ایسا دُکھ نہیں دیا تھا۔ جیسا یزیدی فوج نے حسینؑ اور اُن کے بیوی بچوں کو دیا۔ مگر بھائی فرات اس میں بھی بھگوان کی ایک لیلا تھی اور امام حسینؑ اس لیلا کو خوب جانتے تھے۔ جب ہی تو وہ اسنتوش اور بے صبر نہیں ہوئے۔

فرات نے جواب دیا سچ کہتی ہو۔ میری بہنو۔ یزید کی فوج اور اس کے سنیاپتی ابن سعد اور شمر بڑے ہی کٹھور دل کے تھے۔ مگر حسینؑ کی بہادری بھی سارے سنسار کی بہادری سے بڑی تھی بولو اللہ کے پیارے حسینؑ کی جے۔ فاطمہؑ کے سپوت کی جے۔

پان کی گلوری

شاہی پنواڑی کی آوازیں } کہتے ہیں۔ غدر سے پہلے دہلی میں عوام کو حقہ پلانے والے ساقی اور پان بیچنے والے پنواڑی بازار میں بڑی شان سے نکلتے تھے۔ اور موزوں فقرے خوش آوازی سے عوام کو سُناتے تھے۔ اور ہندو مسلمان دونوں ایسے پنواڑیوں سے پان خرید کر کھاتے تھے اس زمانہ کے ایک پنواڑی کا قصہ سُناتا ہوں جس کا نام حسینی تھا۔ خانم کے بازار میں رہتا تھا۔ جو اب موجود نہیں ہے۔ اور اُس جگہ پریڈ کا میدان نظر آتا ہے۔

حسینی پنواڑی بازار میں آتا تو لال پگڑی باندھے۔ لال انگرکھا پہنے صاف ستھرا۔ ایک تھال ہاتھ میں لئے جس کے اندر پان کی گلوریاں چاندی کے ورق لگی بھری ہوئی۔ چوک میں کھڑا ہوتا۔ اور یوں بلند آواز سے گاتا تھا "لے لو پان کی گلوری" گوری چبائے لال بن جائے جیسے لیلےٰ کے ہاتھ۔ اور مجنوں کا جگر۔ اور آسمان کی شفق۔ ہرا ہرا پان ہے۔ لال لال شان ہے۔ بدخشاں کی کان ہے یہ پان ہے یہ پان ہے کھا لو میرا بیڑا لے لو میرا بیڑا یہ بیڑا ہے پان کا۔ بڑھیا دکان کا۔ جدائی کی رات میں ساتھ رہتا ہے۔ ملاپ کی رات میں مزا دکھاتا ہے۔ میرے پان کا یہ بیڑا۔

ہیں پان کا بے پاری۔ یہ پان ہے سرکاری۔ اس کو کھاتے ہیں درباری۔

ہریالہ ہے۔ متوالہ ہے۔ اچھے جوبن والا ہے میرے پان کا یہ بیڑا۔

دل دار کی ایک شان ہے یہ پان اُسکی جان ہے اور جان بھی ایک پان ہے۔ لے لو میرے پان کی گلوری۔

کندن کو شرماتی ہے۔ جوبن کو چمکاتی ہے۔ اچھے منہ کو سُہاتی ہے گوری جب چباتی ہے ہونٹوں آگ برساتی ہے۔ لے لو گوری کے لئے گلوری۔

غدر سے پہلے دلّی کے سب دُکاندار اُجلے رہتے تھے۔ اور اپنی چیزوں کو بھی صاف ستھرا رکھتے

تھے حُقّہ پلانے والے ساقی۔ اور پان بیچنے والے پنواڑی بھی بہت صاف سُتھرے رہتے تھے۔ ان کے پان بھی بہت صاف ہوتے تھے۔ وہ پہلے ایک ایک پان کو پانی سے اچھی طرح دھوتے تھے کیونکہ پان کی رگوں میں خشخش کے دانوں سے بھی چھوٹے چھوٹے کیڑے چمٹے رہتے ہیں۔ اور اُن کو پانی سے صاف نہ کیا جائے تو پان کھانے والوں کے پیٹ میں جاکر طرح طرح کی بیماریاں پیدا کر دیتے ہیں۔ اور پان کھانے والوں کے مسوڑھوں اور دانتوں اور حلق میں بھی ان کیڑوں کے زہر سے بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ پُرانے زمانہ میں پنواڑی لوگ بھی اور گھر کی عورتیں بھی پانوں کو دھو دھو کر اور پانوں کی رگیں صاف کر کے اُجلی صافیوں میں رکھتی تھیں۔ اور کتھہ بھی صاف پانی میں پکا کر کلھیوں میں ڈھک کر رکھا جاتا تھا اور چونہ کی بھی خاص احتیاط صفائی کی رکھی جاتی تھی سب ادنیٰ اعلیٰ گھروں میں پان دان اور پٹاریاں ہوتی تھیں۔ جن کے اندر کتھے چونہ کی کلھیاں زردہ چھالیہ کی ڈبیاں۔ الائچیوں اور بُن چکنی وغیرہ کی ڈبیاں الگ الگ ڈھکنوں سے ڈھکی ہوئی پٹاری کے اندر رہتی تھیں۔ اور سگھڑ عورتیں سویرے اُٹھ کر سب سے پہلے پاندان اور پٹاری کی صفائی کا انتظام کرتی تھیں۔ کتھہ چونہ کی چمچیوں کو روزانہ دھوتی تھیں۔ اور ہر عورت کا سگھڑاپا اُس کے پان دان کی صفائی سے ظاہر ہو جاتا تھا۔

مگر آج کل نہ پان بیچنے والے پنواڑی صاف سُتھرے ہوتے ہیں نہ گھروں کی عورتیں پانوں کی صفائی اور نہ پاندان کی صفائی کا خیال کرتی ہیں صوبہ بمبئی میں ہاتھ کی انگلی سے پان پر چونہ لگاتے ہیں۔ اور سوکھا کتھہ چھڑک دیتے ہیں۔ یہ بہت معیوب عادت ہے۔ کسی کے ہاتھ میلے ہوں تو اس طرح انگلیوں کا زہر پان کو لگ جاتا ہے اور اُس سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور پان کی رگوں کو نظر نہ آنے والے چھوٹے کیڑوں سے صاف کرنے کا تو نہ آجکل کسی پنواڑی کو خیال آتا ہے۔ نہ گھر کی عورتوں کو۔ شہروں اور قصبات اور دیہات سب ہی جگہ پان کا رواج ہو گیا ہے غدر سے پہلے ایسا عام رواج نہ تھا۔ مگر اب تو سوائے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کے سب عورت مرد ہندوستانی پان کھانے لگے ہیں۔ مگر جتنا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ اتنی ہی صفائی سے بے توجہی بھی ترقی کر رہی ہے۔ اول تو پان

بیچنے والوں کی دکانیں بہت میلی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ پانوں کے مٹھے بہت گندے اور بہت میلے کپڑوں میں رکھ کر پارسلوں میں بھیجے جاتے ہیں۔ پان چماریوں کے سڑے ہوئے اور پھٹے ہوئے نہایت میلے لہنگوں میں لپیٹ کر ٹوکریوں میں بھر کر پارسل کئے جاتے ہیں۔ ان پرانے کپڑوں کو جو عموماً گاڑھے کے ہوتے ہیں۔ لسیمہ کہا جاتا ہے۔ اگر پان بیچنے والوں سے کہو کہ تم ایسے گندے اور ایسے میلے کپڑوں میں پان کیوں فروخت کرتے ہو۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ پان ایسے ہی کپڑوں میں خوش رہتا ہے۔ مگر ان کا یہ جواب غلط ہے۔ دراصل پان کو تری کی ضرورت رہتی ہے۔ باریک کپڑے میں پان لپیٹے جائیں۔ تو کپڑا جلدی سوکھ جاتا ہے۔ اس واسطے پان بیچنے والے موٹی کھدر کے کپڑے کو پانی میں گیلا کر کے پانوں پر لپیٹ دیتے ہیں اور محض کنجوسی کے سبب پاک اور اُجلی کھدر نہیں خریدتے۔ اور کہتے یہ ہیں کہ پان میلے کپڑوں میں اچھے رہتے ہیں۔ سرکار کے طبی محکمہ کے ذریعہ ان پان فروشوں کو مجبور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ میلے کپڑوں میں پان فروخت نہ کریں۔ ایسے ہی ہر مقام کی میونسپل کمیٹیاں تنبواڑیوں کی دُکان کو صاف رکھنے کا حکم دیں۔ کمیٹیاں حلوائیوں نان بائیوں اور قصائیوں کو صفائی کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ کھانے کی چیزیں فروخت کرتے ہیں۔ تو تنبواڑیوں کو بھی مجبور کرنا چاہیئے کہ وہ بھی اپنی دُکانوں کو صاف رکھیں اور اپنے لباس کو صاف رکھیں اور پانوں کو صاف اور اُجلے کپڑوں میں لپیٹا کریں۔ اور کتھے چونہ کی کلھیوں کو ڈھک کر رکھا کریں تاکہ اُن کے اندر زہریلی چیزیں گرنے نہ پائیں۔ اور کتھے چونے کی چمچیوں کو بھی روزانہ دھولیا کریں۔ اور پان بنانے سے پہلے ہر پان کی رگوں کو پانی سے دھو کر صاف اُجلے کپڑے سے صاف کر لیا کریں۔ اور جو تنبواڑی ایسا نہ کرے اس کے پان کوئی ہندو مسلمان نہ خریدے۔ میں دوبارہ کہتا ہوں کہ پہلے پان فروشوں کے کپڑوں کو دیکھو۔ پھر اُن کے ہاتھوں کو دیکھو۔ پھر اس برتن کو دیکھو۔ جس میں بنے ہوئے پان یا گلوریاں رکھی ہوں۔ پھر کتھہ چونہ کو دیکھو۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی میلی ہو۔ تو ایسے تنبواڑی سے ہرگز پان نہ خریدو۔

پان کی پیک پان ہندوستان کی چیز ہے ہندوستان کے باہر کہیں اس کا رواج نہیں ہے۔ البتہ برما کے ملک میں جو اب ہندوستان سے الگ کر دیا گیا ہے۔ پان کا رواج ہندوستان سے بھی زیادہ ہے۔

ہندوستان میں پان کھانے کا رواج صدیوں سے ہے حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے آج سے چھ سو برس پہلے اپنی تصنیفات میں پان کا ذکر کیا ہے۔ اور اسپین کے مشہور سیاح ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامہ میں پان کا حال لکھا ہے۔ کہ سلطان محمد تغلق شہنشاہِ ہندوستان کی دعوتوں میں کھانے سے پہلے شربت پلایا جاتا تھا۔ اور کھانے کے آخر میں پان کی گلوری دی جاتی تھی اور پان کے رواج کے ساتھ ہی ہر جگہ پیک دان یا اُگالدان بھی رکھے جاتے تھے۔ پہلے زمانہ والے آجکل کے لوگوں کی طرح نہیں تھے۔ جو پان کھا کر پان کی پیکیں دیواروں پر اور سیڑھیوں پر اور گھروں کے اُجلے فرش پر تھوکتے پھرتے ہیں۔ یہ بہت بے تمیزی کی بات ہے۔ خود پان کھاؤ۔ یا کسی مہمان کو پان دو۔ تو پہلے اُگالدان اپنے پاس رکھ لو۔ یا مہمان کے پاس رکھ دو۔ اور مہمانوں کو سمجھا دو کہ وہ پان کی پیکیں دیواروں یا فرش پر نہ تھوکیں۔ بلکہ اُگالدان میں تھوکیں۔ میرے ہاں درگاہ میں سالانہ دو عرس ہوتے ہیں۔ اور ہر عرس میں ہزاروں مہمان میرے مکانوں میں ٹھہرتے ہیں۔ اس لئے میں مہمانوں کے لئے سیکڑوں اُگالدان تیار رکھتا ہوں۔ اور سب مکانوں میں تقسیم کرا دیتا ہوں لیکن عرس ختم ہونے کے بعد دیکھتا ہوں تو اُگالدان خالی رکھے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ مہمان فرش کی دریاں اُٹھا اُٹھا کر زمین پر تھوکتے رہتے ہیں۔ ایسے بے تمیز آدمیوں کو سدھارنا جانوروں کو آدمی بنانے کی برابر ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس قسم کی بے تمیزیاں وہ لوگ کرتے ہیں۔ جو پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ کیونکہ مجھے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو انگریزی اور عربی اور فارسی علوم کے فاضل ہیں۔ مگر ان بے تمیزیوں میں بھی کامل ہیں۔ اس واسطے میرا خیال ہے کہ گاؤں والوں سے زیادہ شہروں اور قصبوں کے باشندے اصلاح اور سدھار کے قابل ہیں۔ خصوصاً پان کھانے کے مسئلہ میں تو عورت مرد یکساں شریک ہیں

میں بھی بیس پچیس برس سے پان کھاتا ہوں۔ میرے گھر کے ہر غسلخانے اور ہر پاخانہ میں ایک ایک اُگال دان رکھا رہتا ہے۔ اور جن زینوں سے میں اپنے گھر میں آتا جاتا ہوں وہاں بھی اُگالدان رکھے رہتے ہیں۔ میرے رہنے کے گھر میں سات آٹھ جگہ ایسی ہیں جہاں میں پچھلی رات کو بیدار ہو کر لکھنے کا کام کرتا ہوں۔ اس واسطے میری بیوی ہر شام کو ہر مقام پر قلم دوات اور کاغذ اور بنے ہوئے پان اور ایک ایک اُگالدان رکھوا دیتی ہیں۔ کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ آج پچھلی رات کو میں کس جگہ بیٹھ کر تحریری کام کروں گا۔ اور لکھتے وقت مجھے پان کھانے کی بہت زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔ اور بغیر پان کھائے میں دو فقرے بھی موزوں طریقہ سے نہیں لکھ سکتا۔

عورتوں سے درخواست؛ آخر میں تمام ہندوستان کی تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ عورتوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ پانوں اور پاندانوں اور اُگالدانوں کی صفائی کو گھر کے سب کاموں سے مقدم سمجھیں۔ اگر وہ ایسا کریں گی تو ان کے گھروں کی سینکڑوں بیماریاں دور ہو جائیں گی۔ اور ان کو دانتوں اور مسوڑھوں اور حلق اور معدہ کی کوئی بیماری ستانے نہ پائیگی

بے جان کی زبان اور جان کے کان

ذیل میں حضرت خواجہ حسن نظامی کی ان سترہ تقریروں کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جو دہلی ریڈیو اسٹیشن میں ۲۳ جولائی ۱۹۳۶ء جمعرات کو دن کے ایک بجے گراموفون کے ۹ ڈورخے ریکارڈوں کے تعارف میں براڈ کاسٹ (نشر) کی تھیں۔ اور جن کو سن کر ہندوستان کے ہندو مسلمان سننے والوں نے بے حد پسندیدگی ظاہر کی تھی۔

ہستی کا غم } جس طرح آدمی کا بچہ پیدا ہوتے ہی روتا ہے اسی طرح جب اس دنیا کی ہستی ظاہر ہوئی تو اس نے اپنے وجود کا غم اس نغمہ سے ظاہر کیا اس ریکارڈ کے نغمے موجودات کے نوحے ہیں

کائنات کی خوشی } جب ہستی اپنے وجود پر رو چکی تو اس نے ایک خوشی کا ترانہ بھی گایا تاکہ وجود کی زندگی اکتا نہ جائے۔ جہاں خوشی اور غم جوڑواں پیدا ہوتے ہیں۔

عناصر کا ماتم } جب انسان دنیا میں نمودار ہو گیا تو یہاں کے سب عناصر اس کی برائی کو دیکھ کر رونے لگے اور انھوں نے یوں اظہار غم کیا۔

سمندروں کا غصہ } آدمی نے سمندروں پر حکومت کرنی چاہی تو سمندروں نے غصہ میں یہ ترانا گایا۔ اس ریکارڈ میں موجیں ہیں۔ لہریں ہیں اور غصہ ہے۔

آکاش کا نوحہ } آدمی ہوائی جہاز سے کر آکاش میں اڑنے لگا۔ تو آکاش اور فضا نے ریڈیو کی لہروں کے ذریعہ یہ نوحہ ہر جگہہ گایا۔

جمادات کی فریاد } آدمی نے سونے چاندی لوہے پتھر سے خدمت لینی شروع کی تو ان سب نے ملکے یوں صدائے فریاد بلند کی

نباتات اور حیوانات کا افسوس } جب آدمی نباتات اور حیوانات کو کھانے لگا تو اُن سب نے مل کر اس طرح اپنے رنج و افسوس کو ظاہر کیا ۔

حُسن کا شکوہ } جب بُلبُل نے پھول کے اور پروانہ نے روشنی کے حُسن پر محبت کا دعویٰ کیا تو حُسن نے خفا ہو کر اس رعنائی سے اپنی برہمی ظاہر کی ۔

لنگڑے سچ کا گیت } کہا جاتا تھا جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے مگر دیکھا یہ کہ جھوٹ کے سو پاؤں ہیں اور سچ لنگڑا ہے ۔ بلکہ اس کے دونوں پاؤں نہیں ہیں اور اس کو جھوٹ کے پاؤں کے سہارے سے چلنا پڑتا ہے تو بیچارہ سچ بے بس ہو کر رونے لگا اور یوں گایا ۔

مان ابھمان } جب ہر آدمی اپنے مان اور عزت اور اقتدار کا دیوانہ بنا اور ابھمان اور غرور سے دوسرے آدمیوں کو بے عزت کرنے لگا تو نرک یعنے دوزخ کی شکتیوں طاقتوں نے اس کو یہ گیت سُنایا ۔

چُپ کے بول } تار چُپ تھا ۔ لکڑی چُپ تھی ۔ کھال چُپ تھی ۔ خدا نے کہا سوکھے تار ۔ سوکھی لکڑی ۔ سوکھی کھال ۔ میرے حکم سے بولو ۔ تو باجہ کے خاموش تار بجنے لگے ۔ لکڑی کا باجہ بولنے لگا کھال کے ڈھول بھی بولنے لگے اور ان سب نے مل کر کہا یہ ہماری آوازیں نہیں خدا کی آوازیں ہیں ہم تو فقط گراموفون کے ریکارڈ کی طرح ہیں جو بے آواز اور بے جان ہوتا ہے مگر بولتا ہے ۔

فٹ بال کا گیت } جب فٹ بال کو کھیل کے میدان میں سب ٹھوکریں مار رہے تھے اور وہ ہر کھلاڑی کے پاس پناہ لینے دوڑ رہی تھی مگر کوئی پناہ نہ دیتا تھا ۔ تو گیند روئی اور اس نے یہ گانا گا کر کہا کہ میرے اندر خودپسندی کی ہوا نہ ہوتی اور میں گھمنڈ سے پھولی ہوئی نہ ہوتی تو مجھے یوں ٹھکرایا نہ جاتا ۔ اور میرے ہم جنس چمڑہ کا بوٹ میرے ٹھوکر نہ مارتا ۔

غیبی آوازیں } اس ریکارڈ کی آوازیں غیبی ہیں اور سننے والے آدمیوں سے کہتی ہیں کہ وہ سب آپس میں ایک ہو جائیں ایک دوسرے سے محبت کریں ۔ اور ایک دوسرے کو امداد دیں اور حسد ترک کر دیں کہ زندگی آپس کے میل اور خوشی کا نام ہے ۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کی تصنیفات

حضرت امیر خسروؒ

جو ۱۷ اگست ۱۹۳۶ء عیسوی کو نشر ہوئی

حضرت امیر خسروؒ لاچین نسل کے ترک تھے۔ اُن کی والدہ ہندو نسل کی تھیں یہی وجہ تھی کہ امیر خسروؒ ہندی زبان جانتے تھے اور اُن کی ہندی شاعری اُن کے زمانہ میں خود اُن کی ایجاد معلوم ہوتی تھی کیونکہ حضرت امیر خسروؒ کے وقت میں مسلمانوں کو ہندی شاعری کی طرف توجہ نہ تھی۔

امیر خسروؒ پٹیالی میں پیدا ہوئے جو علی گڈہ کے قریب ایٹہ کے ضلع میں ایک پرانا قصبہ ہے اُن کے نانا اسلامی سلطنت میں ایک بڑے ہندو جاگیردار تھے۔ ان کے والد کا نام امیر سیف الدین محمود تھا جو امیر خسروؒ کو ۹ برس کا چھوڑ کر انتقال کر گئے تھے۔

امیر محمود فوجی آدمی تھے۔ اور امیر خسروؒ کی پیدائش کے وقت ہندوستان میں حکومت بھی ترکوں کی تھی۔ اس لئے امیر محمود حکمران خاندان کے ہم قوم تھے۔

ہندوستان میں ترکوں کی حکومت غلاموں کی حکومت کہی جاتی ہے کیوں کہ سلطان شہاب الدین محمد غوری نے جب ہندوستان فتح کر کے اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی تو اپنے سپہ سالار قطب الدین ایبک کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا۔ اور خود غزنی و غور کی طرف واپس چلا گیا۔ قطب الدین ایبک قوم کا ترک اور شہاب الدین غوری کا غلام تھا۔ اس لئے ایبک کی حکومت غلام خاندان کی حکومت مشہور ہو گئی حالانکہ ایبک اور اس کے بعد کے سب بادشاہ کسی کے غلام نہ تھے۔ ایبک کے بعد بڑا اور مشہور شہنشاہ شمس الدین التمش ہوا پھر اس کی بیٹی رضیہ سلطان ہوئی۔ التمش کی قبر قطب مینار کے نیچے ہے۔ اور رضیہ سلطان کی قبر دہلی کے محلہ چتلی قبر کے قریب بلبلی خانہ میں ہے۔

رضیہ کے بعد بڑا شہنشاہ غیاث الدین بلبن ہوا اور بلبن کے بعد اس کا پوتا معز الدین کیقباد ہوا۔ جس پر غلام یعنے ترک سلطنت ختم ہو گئی اور جلال الدین خلجی حاکم سامانہ پٹیالہ سے دہلی

میں آکر کیقباد کو اس کے مشہور قصر کے اندر گھس کر قتل کر دیا اور لاش کمبل میں لپیٹ کر جمنا دریا میں ڈال دی جو قصر کے نیچے بہتا تھا۔ یہ قصر اس مقام پر تھا جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب پرنسپل جامعہ ملیہ نے اپنی قومی یونی ورسٹی کی نئی عمارات بنانی شروع کی ہیں گویا جہاں غلامی دریا میں ڈوبی تھی اب وہاں علمی آزادی کی عمارتیں بن رہی ہیں۔

حضرت امیر خسروؒ اپنے والد امیر محمود لاچین اور اپنے بڑے بھائی امیر اعزالدین علی شاہ لاچین کے ساتھ دلی میں آئے تو سلطان بلبن کی حکومت تھی۔ امیر محمود کو فوج کا ایک بڑا عہدہ دیا گیا۔ اور امیر خسروؒ دہلی میں رہنے لگے مگر سال میں ایک دفعہ اپنے نانا راوت عرض کی جاگیر پٹیالی میں بھی جایا کرتے تھے۔

مریدی کا واقعہ امیر خسروؒ نو برس کے تھے اور شعر اس عمر میں بھی خوب کہتے تھے۔ ایک دن ان کے والد امیر سیف الدین محمود نے دونوں لڑکوں سے کہا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اس وقت دلی میں بڑے بزرگ ہیں چلو میں تم دونوں کو ان کے پاس لے چلوں وہ تم کو دُعائیں دیں گے اور تم اُن کے مرید بھی ہو جانا۔

چنانچہ یہ تینوں حضرت کی خانقاہ کے دروازے پر آئے۔ جو اب بھی ہمایوں کے مقبرہ کے گوشہ شرق و شمال میں موجود ہے۔ جمنا دریا خانقاہ کی دیوار کے نیچے بہتا تھا۔ امیر خسروؒ نے باپ سے کہا کہ اندر نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ جب تک خود میرے اندر مرید ہونے کی عقیدت پیدا نہ ہو۔ مرید ہونا نہیں چاہتا۔ باپ نے بڑے بیٹے سے پوچھا انھوں نے جواب دیا کہ آپ میرے باپ ہیں آپ وہی کام کریں گے جو میرے لئے اچھا ہوگا اس واسطے میں اندر جاؤں گا اور حضرت کا مرید ہوں گا۔ چنانچہ امیر خسروؒ باہر بیٹھ گئے اور امیر سیف الدین محمود اپنے بڑے لڑکے علی شاہ کے ساتھ اندر چلے گئے۔ اور علی شاہ حضرت کے مرید ہو گئے۔

امیر خسروؒ نے باہر بیٹھے بیٹھے دل ہی دل میں ایک رباعی مخزن کی اور خیال کیا کہ اگر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ میرے پیر بننے کے قابل ہیں تو میرے دل کی بات کو معلوم کر کے

اس رباعی کا جواب بھیجیں گے ورنہ میں واپس چلا جاؤں گا۔ وہ رباعی فارسی میں تھی اور یہ تھی

تو آں شاہے کہ بر ایوان قصرت — کبوتر گر نشیند باز گردد

غریبے مستمندے بردر آمد — بیاید اندروں یا باز گردد

یعنے آپ ایسے بادشاہ ہیں کہ اگر آپ کے محل کی منڈیر پر کوئی کبوتر آن بیٹھے تو برکت کے اثر سے باز بن جائے۔ باز مشہور شکاری پرندہ کو کہتے ہیں جو پرندوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے آپ کے دروازہ پر ایک غریب اور ناچیز آدمی آیا ہے اندر آجائے یا واپس چلا جائے؟

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ علی شاہ کو بیعت کر کے خاموش بیٹھے تھے سیکڑوں آدمی مجلس میں حاضر تھے اور وہ سب بھی ادب سے چپ تھے۔ یکایک حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے گردن اونچی کی اور اپنے خدمت گار مبشر نامی کو پکارا مبشر دوڑا ہوا قریب آیا۔ حضرت نے فرمایا۔ دیکھو باہر ایک ترک بچہ بیٹھا ہے اس کے پاس جاؤ اور یہ رباعی پڑھ کر چلے آؤ۔ سوائے رباعی پڑھنے کے اور کوئی بات نہ کرنا وہ رباعی یہ تھی۔

بیاید اندروں مرد حقیقت — کہ با ما یک نفس ہم راز گردد

اگر ابلہ بود آں مرد ناداں — ازاں راہے کہ آمد باز گردد

یعنے حقیقت کے میدان کا مرد اندر آجائے۔ تاکہ ہمارے ساتھ کچھ دیر ہم راز بن جائے لیکن اگر وہ آدمی نادان اور ناسمجھ ہے تو جس راستہ آیا ہے اُلٹا چلا جائے۔

جس وقت مبشر خدمت گار نے حضرت کی یہ رباعی امیر خسروؒ کے سامنے پڑھی امیر خسروؒ رونے لگے اور خانقاہ کے اندر جا کر حضرت کے قدموں میں سر رکھدیا۔ اور مرید ہونے کی درخواست کی۔ حضرت نے امیر خسروؒ کو مرید کر لیا اور فرمایا میرے پاس رہو اور کچھ پڑھو۔ چنانچہ امیر خسروؒ حضرت کی خانقاہ کے حجرہ میں رہنے لگے اور حضرت سے تعلیم ظاہری اور تعلیم باطنی حاصل کرنے لگے۔

مشہور مورخ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک دن حضرت خواجہ نظام الدین

اولیاؒ اپنے مریدوں کے ہجوم کے ساتھ دہلی کے بازار سے گزر رہے تھے اور امیر خسروؒ بھی ساتھ تھے۔ امیر خسروؒ نے دیکھا۔ بازار میں نان بائی کی دکان پر ایک خوبصورت لڑکا بیٹھا ہے امیر خسروؒ اس کے پاس گئے اور اس سے پوچھا روٹی کس بھاؤ فروخت کرتے ہو؟ لڑکے نے امیر خسروؒ کو غور سے دیکھا اور ہنس کر کہا میری دکان کا دستور ہے کہ روٹی تول کر دی جاتی ہے۔ ترازو کے ایک پلڑہ میں روٹی رکھتا ہوں اور گاہک سے کہتا ہوں کہ دوسرے پلڑہ میں اشرفیاں ڈالو۔ اور جب اشرفیوں کا پلڑہ جھک جاتا ہے تب گاہک کو روٹی دی جاتی ہے امیر خسروؒ نے پوچھا۔ اگر کسی کے پاس اشرفیاں نہ ہوں؟ لڑکے نے کہا۔ تب دل کا درد لیا جاتا ہے۔ یہ جواب سُن کر امیر خسروؒ رونے لگے۔ اور خانقاہ میں آکر حضرت سے واقعہ عرض کیا۔ مگر حضرت نے کچھ جواب نہ دیا۔ امیر خسروؒ اپنے حجرہ میں چلے آئے اور تین رات دن حجرہ کے اندر روتے رہے نہ کھانا کھایا نہ سوئے نہ باہر نکلے۔

چوتھے دن وہ لڑکا حضرت کے پاس روتا ہوا آیا اور اُس نے کہا میں نے اپنی دُکان راہ خدا میں لٹادی مجھے مرید کرلو اور خدا کا راستہ بتاؤ۔ حضرت نے فرمایا ابھی مرید ہونے کا وقت نہیں آیا۔ پہلے تم تعلیم حاصل کرو۔ اس کے بعد پوچھا خسروؒ کہاں ہے۔ اس کو بلاؤ اور کہو کہ اس لڑکے کو اپنے سبق میں شریک کرلے۔ امیر خسروؒ سامنے آئے روتے روتے آنکھوں پر ورم آگیا تھا۔ حضرت نے نان بائی کے لڑکے سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے۔ لڑکے نے جواب دیا۔ میرا نام حسن ہے علا سنجری بھی کہتے ہیں۔ حضرت نے امیر خسروؒ سے کہا جاؤ حسن علا سنجری کے ساتھ پڑھا کرو۔ حسن نے عرض کی مجھے شاعری کا شوق ہے فرمایا۔ خسروؒ بھی شاعر ہے تم دونوں شعر کی مشق بڑھاؤ۔ اس سے لیاقت پیدا ہوتی ہے۔

تاریخ فرشتہ کا بیان ہے کہ اسی تعلیم و تربیت کے زمانہ میں امیر خسروؒ کے والد امیر سیف الدین محمود لاچین کا انتقال ہوگیا۔ اور امیر خسروؒ نے اپنے والد کا ایک بہت اچھا مرثیہ لکھا جس کا پہلا شعر فرشتے نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے جو یہ ہے۔

سیف از سرم گزشت دلِ من دو نیم شد	دریائے من رواں شدہ دریتیم ماند

یعنی تلوار (باپ کے سیف الدین نام کا اشارہ کیا ہے) میرے سر سے گزر گئی۔ اور میرا دل دو ٹکڑہ ہو گیا۔ میرا دریا روانہ ہو گیا اور میں در یتیم اکیلا رہ گیا۔ امیر خسروؒ کی یتیمی کے بعد پیر کی شفقت و محبت اور زیادہ ہو گئی۔

اس زمانہ میں بلبن کا ولی عہد محمد خاں ملتان اور دیپال پور کی گورنری سے دہلی میں آیا وہ شاعروں کا بڑا قدردان تھا اس نے سُنا کہ حضرت کے دو شاگرد بہت اچھے شاعر ہیں تو اس نے اپنے باپ شہنشاہ بلبن کے ذریعہ حضرت کی خدمت میں عرض کرائی کہ خسرو اور حسن کو مجھے دیدیجئے میں ان کو اپنا مصاحب بنانا چاہتا ہوں حضرت نے اس درخواست کو قبول کر کے خسرو اور حسن کو وہاں بھیجدیا۔ اور یہ دونوں شہزادہ ولی عہد کے ساتھ ملتان چلے گئے۔ شہزادہ ولی عہد نے امیر خسروؒ کو دوات اٹھانے کا عہدہ دیا۔ اور حسن کو قرآن شریف اُٹھانے کی خدمت دی جو ترک حکومت میں سب سے بڑی عزت کی نوکریاں تھیں)۔

کچھ عرصہ کے بعد ہندوستان پر مغلوں کا حملہ ہوا اور شہزادہ محمد خاں عصر کی نماز پڑھ رہا تھا کہ مغل فوج نے حملہ کر کے اسے قتل کر دیا اور امیر خسروؒ اور حسن مغلوں کے قیدی ہو گئے مغلوں نے ان دونوں شاعروں کو بہت ایذا دی ان کے ہاتھوں میں رسیاں باندھیں اور گھوڑوں کے ساتھ اُن کو دوڑایا۔ غرض بہزار دقت یہ دونوں مغلوں کی قید سے چھوٹ کر دلی میں آئے۔ اور امیر خسروؒ نے شہنشاہ بلبن کے دربار میں اس کے ولی عہد کا مرثیہ ایسے دردناک انداز سے پڑھا کہ شہنشاہ اور سب درباری زار و قطار رونے لگے شہنشاہ نے امیر خسروؒ کو ملک الشعراء یعنی سب شاعروں کا بادشاہ خطاب دیا اور حسن کو فوج کا ایک بڑا عہدہ دیا گیا۔

امیر خسروؒ دربارداری کے زمانہ میں بھی روزانہ اپنے پیر کے پاس جاتے تھے اور حسن بھی جاتے تھے۔ مگر حسن کو حضرت نے اب تک مرید نہیں کیا تھا۔ اور حسن بری صحبت میں بیٹھ

کر شراب پینے لگے تھے۔ ایک دن حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ حضرت خواجہ قطب صاحبؒ کے مزار پر گئے۔ امیر خسروؒ اور سب مرید ساتھ تھے شمسی تالاب کے کنارے دیکھا کہ حسن اپنے دوستوں میں بیٹھے شراب پی رہے ہیں۔ حضرت وہاں کھڑے ہو کر حسن کو دیکھنے لگے۔ حسن نے بھی حضرت کو دیکھا اور جام و صراحی ہاتھ سے رکھ کر نشہ میں بہکتے ہوئے حضرت کے قریب آئے۔ اور کہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اچھی صحبت میں اچھا اثر ہوتا ہے۔ میں سالہا سال سے آپ کے پاس جاتا ہوں مگر مجھ پر تو آپ کی صحبت کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ دیکھ لیجئے کس حال میں ہوں۔ حضرت یہ بات سُن کر خاموش ہو گئے کچھ جواب نہ دیا۔ مگر امیر خسروؒ آگے بڑھے اور کہا۔ حسن دیوانہ ہوا ہے شراب نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ دیکھ پانی کا خاصہ ہے کہ وہ ہر بد بودار چیز کو دھو کر صاف کر دیتا ہے مگر مچھلی پانی کے اندر رہتی ہے اس کی بو پانی دور نہیں کر سکتا مگر یہ قصور پانی کا نہیں ہے۔ بلکہ مچھلی کی ذات کا ہے۔ ایسے ہی حضرت کی صحبت سب کو نیک بنا دیتی ہے۔ مگر تیری اندرونی بدی اتنی زیادہ ہے کہ وہ حضرت کی صحبت سے بھی دور نہیں ہوتی۔ حسن نے امیر خسروؒ کو دیکھا اور چاہتے تھے کہ اُن کو جواب دیں کہ حضرت نے اپنے دونوں ہاتھ اونچے اٹھائے۔ یعنی اشارہ کیا کہ بحث نہ کرو۔ پھر حسن کی طرف دیکھ کر فرمایا " بابا حسن در صحبت اثر ہاست " یعنے بیٹا حسن اچھوں کے پاس بیٹھنے میں بہت بڑا اثر ہوا کرتا ہے " خبر نہیں اس سادہ اور معمولی فقرہ میں کیا جادو تھا۔ کہ حسن نے بہت زور سے ہائے کا نعرہ مارا اور حضرت کے قدموں میں سر رکھ دیا اور اپنا یہ شعر پڑھا

اے حسن توبہ آں زماں کردی　　کہ ترا طاقت گناہ نماند

اے حسن تو نے ایسے وقت گناہوں سے توبہ کی کہ تجھ میں گناہ کرنے کی طاقت ہی نہ رہی اس کے بعد اپنا ایک اور شعر حضرت کو مخاطب کر کے پڑھا۔

بندہ حسن بصد زباں گفتہ کہ بندۂ توام　　تو بزباں خود بگو بندہ نواز کیستی

یعنے آپ کے غلام حسن نے سینکڑوں زبانوں سے عرض کیا کہ میں آپ کا غلام ہوں۔ ذرا

آپ بھی تو بتائیے کہ آپ کس غلام کو نوازنے والے ہیں۔؟ حضرت نے امیر خسرو رضؓ کی طرف دیکھ کر تبسم فرمایا۔ امیر خسرو رضؓ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی آج میرے دوست کو مرید کر لیجئے۔ حضرت نے فرمایا "یہ نشہ میں ہے اس کا نشہ اُتر رہا ہے۔ اس کو ایسا نشہ درکار ہے جو کبھی نہ اُترے۔ لا ہاتھ بڑھا میں نے تجھ کو نوازا۔ آج سے تو میرا ہو گیا۔ اور میں بھی تیرا ہو گیا۔ گناہ تجھ سے ہٹ گئے" خسرو دیکھ حسن کو دیکھ کہتے ہیں جس وقت حضرت نے یہ فرمایا سب نے ایک ایسی چکا چوند دیکھی کہ ہر شخص کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ پھر بھی حسن نہایت مقبول مریدوں میں ہو گئے اور اُنھوں نے حضرت کا ایک روزنامچہ لکھا جس کو آج تک لاکھوں نظامی قرآن مجید کی تلاوت کے بعد روزانہ پڑھتے ہیں۔ اس روزنامچہ کا نام فوائد الفواد یعنی دل کے فائدے۔ ان کا مزار اورنگ آباد کے قریب خلد آباد میں ہے اور ان کی قبر کے برابر ان کی کتابوں کی قبر بھی ہے جو ان کی وصیت کے مطابق دفن کی گئیں تھیں امیر خسرو رضؓ کہا کرتے تھے کہ کاش میری دو سو تصنیفات حسن کے نام ہوتیں اور حسن کا لکھا ہوا مقبول روزنامچہ میرے نام ہوتا کیونکہ میرے محبوب کو حسن کا لکھا ہوا روزنامچہ اتنا پسند ہے کہ ہر جمعہ کو سنتے ہیں امیر خسرو رضؓ کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رضؓ لفظ ترک سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ جو اس زمانہ میں محبوب کے لئے بولا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت اپنے ایک شعر میں امیر خسرو رضؓ کی نسبت فرماتے ہیں

گر برائے ترک ترکم ارہ بر تارک نہند ترک تارک گیرم و ہرگز نہ گیرم ترک ترک

اگر میرے ترک کو مجھ سے جدا کرنے کے لئے میری پیشانی پر آرہ رکھ دیا جائے تو میں اپنی پیشانی پر آرہ چلوا لوں گا مگر اپنے ترک کو ہرگز نہ چھوڑوں گا۔

ایک دفعہ امیر خسرو رضؓ نے حضرت کو مخاطب کر کے کہا۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

حضرت نے سن کر فرمایا۔

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔

یعنی امیر خسرو رضؓ نے کہا میں تجھ میں تو مجھ میں۔ میں تن تو جاں۔

حضرت نے جواب دیا۔ تاکہ پھر کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ تم اور ہو اور میں اور ہوں۔ ایک دفعہ حضرت نے فرمایا کہ اگر شریعت اجازت دیتی تو میں وصیت کرتا کہ امیر خسرو کو بھی میری قبر کے اندر دفن کیا جائے۔ پھر فرمایا اگر قیامت کے دن خدا مجھ سے پوچھے کہ نظام الدین میرے لئے دنیا سے کیا لائے تو عرض کر دوں گا۔ خسرو کے دل کا سوز۔

ایک دفعہ کوئی سائل حضرت کے پاس آیا اس وقت کچھ دینے کو موجود نہ تھا۔ حضرت نے اپنی جوتیاں سائل کو دیدیں۔ سائل واپس چلا گیا۔ امیر خسرو شہنشاہ کے ساتھ بنگال گئے ہوئے تھے۔ واپسی میں ایک سرائے میں قیام تھا۔ چونکہ شہنشاہ کے مصاحب تھے۔ بہت سے ہاتھی گھوڑے لونڈی غلام ساتھ تھے۔ یکایک امیر خسرو نے کہا بوئے پیر می آید۔ بوئے پیر می آید پیر کی خوشبو آتی ہے۔ پیر کی خوشبو آتی ہے۔ لوگوں نے کہا ایک مسافر دلی سے آیا ہے شاید حضرت کے پاس گیا ہو۔

امیر خسرو اس کے پاس گئے اور اس کا حال پوچھا۔ مسافر نے کہا ہاں میں حضرت کے پاس گیا تھا۔ کیونکہ مجھے روپے کی ضرورت تھی مگر حضرت نے یہ دو جوتیاں مجھے دی ہیں۔ امیر خسرو نے مسافر سے پوچھا تم یہ جوتیاں فروخت کرتے ہو؟ مسافر نے کہا کیا دو گے؟ امیر خسرو نے جواب دیا سب ہاتھی گھوڑے سب لونڈی غلام سب روپیہ پیسہ لیلو اور جوتیاں دیدو۔ مسافر نے کہا تم مجھ سے مذاق کرتے ہو۔ امیر خسرو نے اسی وقت سب چیزیں اس کے حوالہ کر دیں اور جوتیاں اس سے لیکر اپنی دستار میں باندھ لیں۔ اس وقت امیر خسرو لکھنؤ میں تھے۔ وہاں سے دلی تک ننگے پاؤں اکیلے پیدل آئے۔ اور جب حضرت کے سامنے پہنچے تو حضرت نے مسکرا کر فرمایا "ترک جوتیاں بہت سستی خرید لیں"۔

حضرت کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ میں آپ کا انتقال ہونے لگا تو امیر خسرو بنگال کے سفر میں تھے۔ حضرت نے فرمایا خسرو واپس آئے تو میری قبر پر نہ آنے دینا ورنہ قبر شق ہو جائے گی اور میں قبر سے باہر آجاؤں گا۔ چنانچہ چھ مہینہ کے بعد

۱۸ شوال ۷۲۵ھ کو امیر خسروؒ بنگال سے واپس آئے۔ انھوں نے پیر کے غم میں گریبان چاک کر لیا تھا۔ اور زار و قطار رو رہے تھے۔ جب مزار کے سامنے پہنچے تو لوگوں نے روکا اور کہا کہ حضرت حکم دے گئے ہیں کہ خسرو کو میری قبر کے پاس نہ آنے دینا۔ یہ سنکر خسرو نے قدم روکا۔ اور نہایت حسرت کی نظروں سے حضرت کے کچے مزار کو کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ پھر اپنا داہنا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا۔ اور روتے روتے اپنا یہ ہندی دوہا پڑھا۔

گوری سوئے سیج پر اور مکھ پر ڈالے کیس　　چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چوندیس

محبوب سیج پر سو رہا ہے۔ اور اس نے اپنے چہرہ پر اپنے بال ڈال رکھے ہیں۔ چل خسرو تو بھی اپنے گھر چل کہ چاروں دیس میں شام ہو گئی۔ یہ کہہ کر آہ کی اور گر پڑے۔ دیکھا تو جسم میں جان نہ تھی جس جگہہ انتقال ہوا اسی جگہہ قبر کھود دی گئی۔ اور دفن کر دیا گیا۔ یہ وہی امیر خسروؒ تھے جن کی شاعری کو ہندوستان کے ہندوؤں نے مانا۔ مسلمانوں نے مانا۔ یہاں تک کہ ایران نے بھی مانا۔ اور حضرت شیخ سعدی نے شہزادہ محمد خاں کے دعوت نامہ کے جواب میں لکھا کہ میں بڑھاپے کے سبب ہندوستان نہیں آسکتا۔ تمہارے پاس خسرو جیسا شاعر موجود ہے۔ جس کے کلام کی ایران کے ہر گھر میں دھوم ہے اُسی کی قدر میری قدر ہے۔

حضرت امیر خسروؒ کی عظیم الشان زندگی کا یہ ایک چھوٹا سا حصہ ہندوستانیوں کے سامنے پیش کر کے اس بیان کو ختم کیا جاتا ہے اگر ان کی پوری زندگی کے واقعات سنائے جائیں تو کئی مہینے درکار ہوں گے۔ خصوصاً ان کی ہندی شاعری تو ایسی چیز ہے جس کو ہندو مسلم اتحاد کی پہلی بنیاد کہہ سکتے ہیں میں نے یہ مضمون تیار کر کے پہلے حضرت امیر خسروؒ کے مزار کے پاس بیٹھ کر بلند آواز سے پڑھا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ حضرت امیر خسروؒ نے قبر کے اندر اُس کو سنا اور خوش ہوئے۔ ان کا مزار میرے گھر سے دس قدم کے فاصلہ پر ہے۔ اور میں روز اُن کی قبر کی زیارت کر کے تحریری کام شروع کرتا ہوں۔

خواجہ حسن نظامی دہلوی کی تقریر

مہمان بلائے جان

جو ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء کی شام کو نشر ہوئی

دسمبر کے مہینہ کا ذکر ہے خوب سردی تھی۔ رات کے بارہ بجے کا وقت۔ بجلی چمک رہی تھی بادل گرج رہے تھے اور بارش بھی ہو رہی تھی میرے نوکر اپنے گھروں میں پڑے سوتے تھے اور میرے بیوی بچے بھی اپنے اپنے لحافوں میں دبکے ہوئے بے خبری کی نیند کا مزہ لے رہے تھے۔ اور میں بھی دو لحافوں میں دبا ہوا پڑا سوتا تھا کیونکہ ایک لحاف سے میری سردی دور نہیں ہوتی۔

ایکا ایکی میرے مکان کے بڑے پھاٹک پر کسی کے چیخنے اور کواڑ کھٹکھٹانے کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ کئی آدمی مل کر آواز دے رہے تھے۔ خواجہ صاحب کو جگاؤ۔ مہمان آئے ہیں دروازہ کھولو ہم بھیگے جاتے ہیں۔ پیارے شاہ پشاوری کا حجرہ پھاٹک کے پاس تھا۔ اور ایک نوکر بھی ان کے حجرہ میں تھا مگر سردی اور بارش کے سبب وہ بولتا نہ تھا اور یا دن بھر کی محنت کے سبب اس کی نیند ایسی غفلت کی تھی کہ اُس کی آنکھ نہ کھلی۔ میری آنکھ کھلی تو میں کمبل اوڑھ کر باہر نکلا۔ سردی سے کانپتا جاتا تھا۔ دانت بج رہے تھے بات منہ سے نہ نکلتی تھی۔ مگر گھر پر آئے ہوئے مہمان کے آرام کا خیال تھا جو میں پھاٹک پر گیا۔ کنڈی کھولی۔ اتنے میں نوکر بھی اُٹھ بیٹھا اور میری آواز سُن کر باہر گیا۔ دیکھا پانچ آدمی ہیں بارش سے تر کھڑے کانپ رہے ہیں۔ بستر کسی کے پاس نہیں ہے۔

اندھیرا تھا میں کسی کی صورت نہ دیکھ سکا نہ آواز سے معلوم ہوا کہ پہلے کبھی سُنی ہو۔ تاہم ان پانچوں کو مردانہ کمرہ میں لایا۔ بجلی کا بٹن دبایا روشنی ہو گئی۔ ان کو کرسیوں پر بٹھایا اور حال پوچھا کہ اس آدھی رات کے وقت کہاں سے آنا ہوا۔ اور آپ کون لوگ ہیں۔ ایک صاحب نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ پہلے سوکھے اور گرم کپڑے منگائیے سردی ہوش لینے دے تو بات کریں۔

میں نے نوکر سے کہا۔ صندوق کھولا۔ تہمد اور کمبل نکال۔ اور ان کو دے۔ مہمان صاحب بولے یہ سردی اور تہمد؟ جناب گرم پاجامے اور گرم قمیص منگائیے۔ میں نے کہا کمبل اور لحاف تو مہمانوں کے لئے میرے ہاں رہتے ہیں مگر گرم پاجامے اور قمیص تیار نہ کرانے کی غلطی ہوئی معاف فرمائیے اس وقت تو گیلے کپڑے اتاریئے تہمد باندھئے کمبل اوڑھیئے۔ میں ابھی آگ منگاتا ہوں گرمائی آجائیگی مہمان صاحب نے بگڑ کر کہا۔ ہم تو یہ سمجھ کر آئے تھے کہ درویش کا گھر ہے مہمانوں کے لئے ہر چیز موجود ہوگی مگر یہاں تو ڈھاک کے تین پات ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اچھا بھئی لا تہمد ہی لا۔ ایسا نہ ہو نمونیہ ہو جائے ایک گھنٹہ سے گیلے کپڑے بدن پر ہیں۔

یہ کہتے ہی دوسرے سانس میں ارشاد ہوا کہ اچھا چاء بنانے کے لئے بھی کہہ دیجئے۔ کھانا ذرا ٹھیر کر کھائیں گے ابھی تو چاء پینی ہے ذرا گرم کر دیگی۔ اگر لونگیں اور دار چینی بھی چاء میں ڈال دی جائے تو گرمی اور لذت بڑھ جائیگی۔ اور کھانے میں انڈے تیار کرنے کو کہہ دیجئے۔ انڈوں میں مرچیں ذرا زیادہ ڈلوائیے۔

میں اب تک تو مہمان کی دل جوئی کے خیال سے درگزر کر رہا تھا مگر جب میں نے دیکھا کہ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام کا معاملہ ہے اور ان لوگوں میں دوسرے کی تکلیف کا کچھ احساس ہی نہیں ہے تو میں نے ہنس کر کہا۔ نہیں جناب اس وقت تو لحاف اوڑھ کر سو جائیے۔ آدھی رات کے وقت چاء بہت نقصان دیتی ہے اور کھانا تو اس وقت زہر کا کام دیگا اور اگر ذکر جہر کیا گیا تو بہت جلد گرمائی آجائیگی

اتنے میں نوکر آگ لایا انگیٹھی چارپائیوں کے بیچ میں رکھدی گئی اور مہمانوں نے قہقہہ مار کر کہا کہ بھئی یہ شاہ جی تو پتھر معلوم ہوتے ہیں یہاں جونک نہیں لگے گی۔ پھر کہنے لگے سُنئے جناب ہم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ ناگدا ریلوے کا راستہ ایسا اُجاڑ ہے کہ کہیں کھانا ملتا ہی نہیں گاڑی لیٹ بھی تھی بارہ بجے نظام الدین اسٹیشن پر اُترے۔ بابو سے پوچھا کہاں ٹھہریں؟ اُس نے آپ کا نام بتایا۔ کہ درویش ہیں اور بڑے ہی مہمان نواز ہیں۔ سیکڑوں مہمانوں کی ٹھہرنے کی جگہ تیار رہتی ہے۔

میں نے کہا سُنئے میں جب کسی کے گھر میں مہمان جانا چاہتا ہوں تو آٹھ دن پہلے میزبان کو اطلاع

دیتا ہوں کہ فلاں وقت پہنچوں گا۔ ایک نوکر ساتھ ہوگا میں چاول نہیں کھاتا۔ چائے نہیں پیتا۔ بستر میرے ساتھ ہوگا۔ صرف ایک رات آپ کے ہاں ٹھہروں گا۔ اور اسی طرح میرے ہاں جو مہمان آتے ہیں ان سے بھی اسی برتاؤ کی توقع رکھتا ہوں۔ اور اسی چیز کا نام شرافت ہے جس کو انگریزی میں جنٹلمینی کہتے ہیں اور جو مہمان اس کے خلاف کرتا ہے یعنی بے اطلاع۔ بے وقت۔ بے جان پہچان کے آجاتا ہے تو میں ایسے مہمان کو بلائے جان تصور کرتا ہوں۔

یہ سنتے ہی مہمان بگڑے اور بولے تو یوں کہئے حضور کو نئی روشنی کی ہوا لگ گئی ہے۔ ہم نے بڑی غلطی کی جو اس گھر میں آئے آئندہ کو کان ہوئے اب کبھی نہ آئیں گے۔ لیکن اس وقت تو چائے اور کھانا ضروری ہے۔ چائے نہ پی۔ اور کھانا نہ کھایا تو صبح تک ہم سب کا خاتمہ ہوجائیگا اور آپ کو پانچ قبریں تیار کرانی پڑیں گی اور پانچ کفن دینے پڑیں گے۔

میں نے کہا کیا مضائقہ ہے قبریں بنوائیں اور کفن دینے بڑے ثواب کا کام ہے۔ میں یہ خدمت بسر و چشم انجام دوں گا۔ اور اگر کوئی وصیت جناب کرنی چاہیں تو اس کو بھی سنوں گا۔ اور اُس کو پورا بھی کروں گا۔

ایک صاحب ان میں مولوی بھی تھے اُنھوں نے مہمانوں کی مدارات اور مہمان نوازی کے فضائل بیان کرنے شروع کئے اور فرمایا کیسا بُرا زمانہ آیا ہے آپ جیسے لوگوں نے بھی مہمانوں کی برکت کو اپنے دلوں اور عمل سے بالکل دُور کر دیا ہے۔ آپ کے حضرت سلطان جیؒ صاحب تو وفات کے وقت بھی یہی دریافت کرتے تھے کہ کوئی مہمان آیا ہو تو اس کی مدارات کرو۔

میں نے کہا یہ کچھ کم مدارات ہے کہ اس سردی اور اس بارش میں لحاف چھوڑ کر یہاں آیا۔ اور آپ کو پناہ دی نوکر بھی آخر آدمی ہے دن بھر کام کر چکا ہے میں اس کو کیوں کر کہوں کہ وہ اس وقت چائے بنائے۔ یہ گاؤں ہے دودھ اس وقت نہیں ملیگا۔ وہ بولے ڈبہ کا دودھ گھر میں ہوگا میں نے جواب دیا۔ اول تو میں ڈبہ کے دودھ کو پسند نہیں کرتا اور پسند کرتا بھی تو نہ بیوی کو ایسے وقت چائے بنانے کی تکلیف دینی چاہتا ہوں نہ نوکر کو۔ اچھا خدا حافظ۔ شب بخیر۔ زندگی ہے تو صبح ملونگا

وہ بولے تو کیا رات بھر ہم قل ھو اللہ پڑھتے رہیں۔ میں نے کہا جی ہاں۔ پہلے اعوذ باللہ پڑھیئے گا۔ پھر بسم اللہ اور پھر قل ہو اللہ تاکہ اس کی برکت سے آپ کو خدا آدمیت عطا فرمائے اور اس طرح آدھی رات کے وقت مان نہ مان میں تیرا مہمان بننے کی جرأت پھر کبھی آپ کو نہ ہو۔

اس کے بعد میں نے نوکر کو اشارہ کیا اور وہ چاء اور انڈے اور بسکٹ لایا۔ اور میں رات کے دو بجے تک جاگتا رہا۔ اور جب مہمان کھا پی کر سو گئے تب میں بھی اپنے بستر پر چلا گیا۔

مہمان دس بجے بیدار ہوئے گرم پانی سے حمام کیا۔ نوکر نے رات کے گیلے کپڑے آگ پر سکھا دیئے تھے وہ پہنے۔ ناشتہ کرنے کے بعد مہمان نوازی کے مسئلہ پر جناب مولانا مبلغ اسلام صاحب سے گفتگو شروع ہوئی۔

میں نے کہا مولانا رات کو میں نے جو باتیں کی تھیں وہ اگر ناگوار ہوئی ہوں تو معاف کیجئے گا مولانا نے فرمایا آپ کا برتاؤ معاف کرنے کے لائق نہیں ہے۔ آپ نے ہمارا مذاق اڑایا۔ اور علماء کی جوتی کا مذاق بھی کیا جائے تو آدمی کافر ہو جاتا ہے۔

میں نے جواب دیا شاید آپ کو معلوم نہیں مجھ پر پانچ دفعہ ڈیڑھ ڈیڑھ سو مولویوں کے دستخطوں سے کفر کے فتوے لگ چکے ہیں بس جو جنگ کا کافر ہو اس کے کفر میں کچھ تو پیچ کے سبب اور کیا اضافہ ہو سکیگا۔

فرمانے لگے کیا تم جانتے ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مہمانوں کی کتنی خاطر کرتے تھے۔ ان کے ہاں تو آسمانی فرشتے بھی مہمانوں کی شکل میں آتے تھے۔ اور ہمارے حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو غیر مہمانوں کی مدارات بھی کرتے تھے اور اپنے گھر کا سارا کھانا مہمان کو کھلا کر خود بھوکے سو جاتے تھے اور اپنا بستر غیر مسلم مہمان کو سونے کے لئے دیدیتے تھے۔ ایک دفعہ ایک غیر مسلم مہمان نے آپ کے بستر پر پاخانہ کر دیا اور اندھیرے سے بھاگ گیا تو حضرت نے مہمان کا پاخانہ اپنے ہاتھ سے دھویا۔ اصحاب رسول اللہ نے ہر چند اصرار کیا کہ لائیے ہم اس گندگی کو دھو ڈالیں مگر حضرت نہ مانے۔ اور فرمایا کہ میرے مہمان کا پاخانہ ہے میں خود اپنے ہاتھ سے یہ دھوؤں گا۔ اتفاق سے وہ مہمان اپنی بھولی ہوئی چیز کو لینے کے لئے واپس آیا اور حضرت کو اپنی

گنبد گی دہوتے ہوئے دیکھا تو قدموں میں گر پڑا اور فوراً مسلمان ہو گیا۔ یہی حال آپ کے پیشوا اور امام اول حضرت علیؑ کا تھا اور یہی عادت تمام اولیاء اللہ کی تھی۔ اگر آپ حضرت ابراہیمؑ کو مانتے ہیں اور حضرت رسول اللہ کو مانتے ہیں تو آپ کو مہمانوں کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرنا چاہیئے جیسا کہ رات کو آپ نے ہمارے ساتھ کیا

میں نے جواب دیا۔ جناب مولانا صاحب میں پیغمبروں اور ولیوں اور مسلمانوں کی مہمان نوازیوں کو جانتا ہوں اور مانتا بھی ہوں۔ لیکن جس زمانہ میں سڑکیں نہ تھیں۔ ریلیں نہ تھیں۔ موٹریں نہ تھیں اور مسافروں کے لئے سرائیں اور ہوٹل نہ تھے۔ اس وقت انسانی ہمدردی کا تقاضا یہ تھا کہ مسافروں کو مہمان بنانا ثواب اور فخر اور عزت کا کام سمجھا جاتا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا کہ راستوں کی مشکلات کے سبب لوگ سفر بھی بہت کم کرتے تھے۔ اور سفر کو سقر کہا جاتا تھا مگر اب ریل اور موٹریں صبح سے شام تک ہزاروں لاکھوں مسافروں کو ادہر سے اُدہر لاتی لے جاتی ہیں ہر جگہ سرائیں اور ہوٹل موجود ہیں اب مہمان نوازیوں کی ضرورت نہیں رہی۔ اور چونکہ بہت سے بیکار اور بے روزگار آدمیوں نے ناخواندہ مہمان بننے اور اسباب چوری ہو جانے کا بہانہ کرکے کرایہ مانگنے کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ اس واسطے میں انہی مہمانوں کی مدارات کرتا ہوں جو مجھے اطلاع دے کر آئیں یا جن سے میری واقفیت ہو۔ پیشہ ور مہمانوں کو بلائے جان سمجھتا ہوں۔ آپ سے میں نے جو معافی مانگی تھی وہ بھی میری جنٹلمینی تھی۔ ورنہ میری رائے اب تک یہی ہے کہ میں نے جو کچھ رات کو کہا تھا وہ بالکل ٹھیک کہا تھا۔ اور میں اپنے مریدوں کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ وہ آپ جیسے ناخواندہ مہمانوں کی مہمان داری سے احتیاط کریں۔ اور شادی غمی کے موقعہ پر جو رسمی مہمانداریاں ہوتی ہیں ان کے بھی خلاف ہوں۔ یہاں تک کہ ولیمہ کی دعوت کو بھی میں آجکل کے زمانہ میں نمود اور ریاکاری سمجھتا ہوں۔

مبلغ اسلام مولانا صاحب یہ سُنکر غصہ سے بے تاب ہو گئے اور اپنے ساتھیوں سے کہا ایسے شخص کے ہاں ٹھہرنا اور کھانا پینا حرام ہے مولانا کے چار دل ساتھی خاموش رہے اور مولانا بار بار ان سے فرمانے لگے کہ چلو اٹھو میں یہاں نہیں ٹھیرونگا تب میں نے مسکرا کر مولانا سے کہا ارشاد

ہو تو نمک پانی منگاؤں مولوی صاحب نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا کیوں ؟ میں نے کہا اس لئے کہ رات کو اور ابھی جو حرام چیزیں آپ نے کھائی ہیں اور پی ہیں ان کو قے کر دیجئے۔ اور نمک پانی کے بغیر قے نہ ہو سکیگی۔ یا مور کا پر منگاؤں۔ اس کو حلق میں پھیرنے سے قے جلدی ہو جاتی ہے۔

یہ سُن کر مولانا کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ لعنت ہے اس شخص پر جو تمہارے ہاں پھر کبھی آئے اور اس کی عورت پر تین طلاق جو تمہارے ہاں مہمان ہو کر کچھ کھائے پیئے۔ میں نے دونوں ہاتھ جوڑے اور دست بستہ کہا اگر حضور اپنی اہلیہ کے رہنے کا پتہ بتا دیں تو میں ان کو آج خط لکھ دوں گا کہ مولانا صاحب نے تم کو پانچ مسلمانوں کے سامنے طلاق دیدی۔ یہ فقرہ سُن کر مولانا کے ساتھیوں نے قہقہہ لگایا اور مولانا کو بھی ہنسی آگئی اور وہ بیٹھ گئے اور پھر سنجیدہ صورت بنا کر بولے شاہ جی آپ کی کھری باتوں سے بہت خوشی ہوئی اور یہ تو آپ نے کمال کیا جو ہمارے بستروں کی چوری کا ذکر باتوں باتوں میں کر دیا۔ آپ بڑے پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا کہ پانچوں آدمیوں کا اسباب ریل میں چوری ہو گیا۔ اور اب ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے جو ہم اپنے گھروں کو پہنچ سکیں کم از کم کرایہ تو ہم پانچوں کو دینا ہی پڑیگا۔ میں نے کہا بسر و چشم میرے ہاں کتابوں اور اخباروں کے کاغذ موڑنے کا کام کیجئے۔ دونوں وقت کی روٹی کے علاوہ دو آنہ فی کس اجرت دوں گا۔ جب اتنی رقم ہو جائے کہ آپ اپنے گھروں کو جا سکیں تو چلے جائیگا اور اس صورت میں آپ کو وہ مکان دیا جائیگا۔ جہاں نوکر رہتے ہیں۔ مولانا کو پھر غصہ آیا اور انھوں نے گالیاں دینی شروع کیں اور ان کے اصرار سے ان کے چاروں ساتھی بھی اٹھ کر چلے گئے اور اس پر مہمان بلائے جان کا قصہ تمام ہوا۔

مہمان بلائے جان عنوان کی فرمائش کی گئی تھی اس لئے میں نے اپنی آپ بیتی کا ایک قصہ سُنا دیا اور اس قسم کے قصے تو مجھے اکثر پیش آتے رہتے ہیں دہلی ریڈیو اسٹیشن نے بھی مجھے اس عنوان پر تقریر کرنے کے لئے غالباً اصلاح کی نیت سے لکھا ہوگا۔

مگر اب تصویر کا دوسرا رُخ دکھانے کی بھی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ مہمان نوازی اور

مہمان داری۔ ایشیائی تہذیب اور مشرقی اخلاق کا سب سے بڑا جوہر ہے اگر خرابیوں کی اصلاح کر دی جائے اور مذکورہ پیشہ ور مصنوعی مہمانوں کے واقعات سے الگ ہو کر مہمان نوازی اور مہمان داری کو قائم رکھا جائے تو ایشیا اور مشرق کی ایک بڑی عمدہ صفت کی حفاظت ہو گی۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے مجھ کو دو واقعات اپنے سفر یورپ کے سنائے تھے کہ ایک دفعہ وہ کسی انگریز کے مہمان تھے اور میز پر کھانا اتنی مقدار میں موجود تھا کہ کئی فالتو آدمی کھا سکتے تھے۔ اسی اثنا میں ایک غریب انگریز وہاں آیا اور اس نے صاحب خانہ سے کہا کہ وہ تین وقت سے بھوکا ہے۔ صاحب خانہ نے جواب دیا تم فلاں خیرات خانہ میں جا سکتے ہو اور جب وہ چلا گیا تو صاحب خانہ نے حکیم صاحب سے کہا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ شخص واقعی بھوکا تھا کیونکہ اکثر بدچلن آدمی فرضی باتیں بنایا کرتے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد حکیم صاحب ترکوں کے پائہ تخت قسطنطنیہ میں گئے اور ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ شام کو پیدل سیر کرنے بازار میں جا رہے تھے کہ ان کو لب سڑک ایک باغ دکھائی دیا۔ حکیم صاحب نے اس کو عام باغ سمجھا اور اس کے اندر چلے گئے۔ اس باغ میں کسی ترک پاشا کی پردہ نشین خانم رہتی تھیں (یہ ذکر ۱۹۱۱ء کا ہے جبکہ ترک عورتیں پردہ کرتی تھیں) ایک نوکر عورت نے حکیم صاحب کو دیکھا تو چیخ کر کہا تم کون ہو جو بے پردہ باغ میں آ گئے۔ حکیم صاحب نے جواب دیا میں مہمان ہوں۔ مہمان کا لفظ سُن کر عورت نے کہا مہمان میرے سر پر اور آنکھوں پر تم سامنے کے کمرہ میں بیٹھ جاؤ۔ پاشا تو باہر گئے ہیں۔ خانم پردہ میں ہیں میں ابھی ناشتہ لاتی ہوں۔ حکیم صاحب نے کہا۔ میں ہوٹل میں ٹھہرا ہوں مجھے ناشتہ کی ضرورت نہیں ہے۔ عورت نے کہا ایک مسلمان ترک کے گھر میں مہمان آئے اور کچھ کھائے پیئے بغیر چلا جائے یہ ناممکن ہے اور ترک کی سب سے بڑی ذلت اور توہین ہے۔ حکیم صاحب یہ سُن کر کمرہ میں بیٹھ گئے وہ عورت پہلے تازہ اخبار دے گئی۔ اور پھر ایک خوان لائی جس میں میوہ تھا اور مٹھائی تھی اور چائے تھی اور خانم کی طرف سے کہا کہ میں مہمان کا شکریہ ادا کرتی ہوں جو میرے گھر پر آیا۔ افسوس ہے پاشا موجود

نہیں ہیں ورنہ وہ مہمان سے مل کر بہت خوش ہوتے جب وہ آئیں گے تو میں ان کو مبارک باد دونگی کہ ایک ہندوستانی مسلمان ان کے گھر میں مہمان آیا تھا۔

ان دونوں واقعات سے مشرق و مغرب اور ایشیا اور یورپ کی مہمان داری کا فرق ظاہر ہو سکتا ہے اسی ۱۹۱۱ء میں میرا سفر بھی اسلامی ممالک میں ہوا تھا میں دمشق کے ایک ہوٹل میں کھانا کھانے گیا تو وہاں میز پر کئی ترک اور عرب پہلے سے کھانا کھا رہے تھے۔ میں السلام علیکم کہہ کر میز کے پاس بیٹھا اور ہوٹل والے نے مجھے کھانا کھلایا جو ترک اور عرب کھا رہے تھے وہ السلام علیکم کہہ کر چلے گئے اور میں نے ہوٹل والے سے اپنا بل مانگا تو اُس نے کہا کہ تمہارے کھانے کی قیمت ترک دے گئے ہیں۔ میں نے کہا کیوں؟ وہ کیوں دے گئے۔ میری تو ان سے واقفیت نہیں تھی نہ میں ان کو جانتا تھا نہ وہ مجھ کو جانتے تھے۔

ہوٹل والے نے کہا وہ مسلمان تھے اور آپ بھی مسلمان ہیں وہ پہلے سے بیٹھے تھے اور آپ بعد میں آئے تھے اس لئے ان پر آپ کی مہمان داری لازم ہو گئی تھی اور مہمان سے واقفیت کچھ ضروری چیز نہیں ہوتی انہوں نے آپ کے کھانے کی قیمت دے کر آپ پر احسان نہیں کیا بلکہ اپنا مسلمان ہونا ثابت کیا۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہمان نوازی اور مہمان داری مشرق والوں کی ایک ایسی اعلیٰ صفت ہے جس کو بلائے جان مہمانوں کی بُرائیوں کے سبب ضائع کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ ہم مغرب سے یہ سیکھ سکتے ہیں کہ مہمان داریوں کی بُرائیوں سے بچیں مگر مہمان نوازی کے وصف کو ترک کرنا اپنی تہذیب اور اپنے اخلاق حسنہ سے منہ موڑنا ہے۔ +

جاٹ کی کھاٹ

جو مئی ۱۹۳۶ء کی شام کو خود خواجہ حسن نظامی نے پڑھی

میری کہانی سننے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ نظام پور گاؤں کے رہنے والے ایک زمیندار جاٹ کا یہ قصہ ہے۔ گاؤں والے چارپائی کو کھاٹ کہتے ہیں۔ اور گاؤں کے مکھیا یا نمبردار یا ذیل دار یا بڑے آدمی گاؤں کی چوپال میں ایک چارپائی پر بیٹھ کر اپنے گاؤں اور برادری کے جھگڑوں کے فیصلے کرتے ہیں۔ گویا زمیندار کی کھاٹ تھانہ دار کی کرسی بھی ہے۔ اور مجسٹریٹ اور جج کی کرسی بھی ہے اور ذاتی بات چیت اور غپ شپ کے کلب گھر کی کرسی بھی ہے۔

زمیندار کی کھاٹ یعنے چارپائی کا نام سن کر سننے والے اپنے گھروں کی نواڑی مسہریوں اور پلنگوں اور ہلکی بانس کی چارپائیوں کا تصور نہ کریں۔ کیونکہ یہ جاٹ کی کھاٹ چارپائی نہیں۔ چارپایہ ہوتی ہے۔ اس کو گاؤں کی زبان میں ماچا کہتے ہیں۔ اس کی چوڑان بعض جگہ دو تین گز کی ہوتی ہے اور لمبان پانچ گز کی۔ اور بعض جگہ اس سے ذرا کم ہوتی ہے۔ اس کی پٹیاں اور پائے بہت بھاری ہوتے ہیں۔ اس کو مونجھ کے بان سے بُنا جاتا ہے۔ اس کو دس بارہ آدمی مشکل سے اُٹھاتے ہیں۔ اس واسطے جاٹ کی کھاٹ قطب از جا نمی جنبد کی طرح بس ایک ہی جگہ بچھی رہتی ہے۔

چوپال گاؤں کے اس مکان کو کہتے ہیں جو کچے مکانوں کے بیچ میں ایک پکا مکان سب گاؤں والے مل کر بنا لیتے ہیں اور وہاں روز شام کو جمع ہوتے ہیں۔ بڑے آدمی ماچے یعنی کھاٹ کے اوپر ہوتے ہیں اور چھوٹے آدمی کھاٹ کے سامنے مٹی سے لپی ہوئی زمین پر اوکڑوں حلقے بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور پھر حقہ اور باتوں کا دور چلتا ہے۔ اور جب کسی گاؤں والے کا کوئی مہمان آتا ہے تو وہ بھی چوپال میں ٹھیرتا ہے اور جب کسی کے ہاں برات

آتی ہے تو وہ بھی چوپال میں ٹھہرائی جاتی ہے اور بڑے ماچے (کھاٹ) کے آس پاس اور بہت سی چھوٹی چھوٹی چارپائیاں بچھا دی جاتی ہیں۔ اور جب تحصیل کا چپراسی یا تھانہ کا سپاہی آتا ہے تو وہ بھی چوپال میں ٹھیرتا ہے اور اُس کو روٹی یا لسّی یا دودھ یہاں بھیجد یا جاتا ہے اور جب تھانہ دار صاحب یا تحصیل دار صاحب کسی مقدمہ کے لئے آتے ہیں تو وہ بھی چوپال میں بیٹھ کر مقدمے طے کرتے ہیں۔ ورنہ روزمرہ گاؤں کے چودہری اور بڑے آدمی حقہ پینے اور باتیں کرنے اور دن بھر کی محنت کی تھکن اُتارنے کو یہاں جمع ہوتے ہیں۔ اب ذرا سُنیئے میں نظام پور گاؤں کی چوپال اور کھاٹ کی اپنے الفاظ میں ایک تصویر دکھاتا ہوں جس میں گاؤں سدہار کی باتیں اس طرح کہہ جاؤں گا کہ گاؤں والوں پر بھی ان کا اثر ہو اور حکومت کے افسر بھی گاؤں سدہار کی ضروری باتوں کو جان جائیں اور شہروں کے رہنے والے وہ آدمی بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکیں جو اپنے ملک کے دیہات کی اصلاح کا کام کرنا ایک سیوا اور نیکی سمجھتے ہیں

چودھری لال سنگھ چوپال کے ماچے پر بیٹھے ہیں اور چاروں طرف گاؤں والے جمع ہیں اور حقہ کا دور چل رہا ہے

چودھری لال سنگھ نے سب کو مخاطب کرکے کہا } آج سانجھ (شام) کو میں گڑگانوہ سے آیا تو لالو کی ماں بولی دُپہرے (دوپہر کو) لالہ اجاگرمل گُڑکی (قرقی) لایا تھا۔ مور سنگھہ کے سب ڈھور ڈنگر گُڑک کر لئے۔ مور سنگھہ کی چھُوری (لڑکی) آج ہی تڑکے (صبح) سا سرے (سسرال) سے باپ دہورے (باپ کے پاس) آئی تھی اور گہنا ٹوم چھلا پہر رکھا تھا (بہت سا زیور پہنے ہوئے تھی) لالہ نے وہ بھی گُڑک کرالیا۔ مور سنگھ نے کہا لالہ جی میری لالی کی ماں نہیں ہے اور یہ ٹوم چھلا ہمارا دیا اوڑ نہیں ہے۔ یہ تو لالی کے سورے (خسر) نے بنایا ہے تم اس کو کیوں گُڑک کر رہو تو لالہ نے ایک نہ مانی۔ اور لالی کی سگری (سب) ٹوم اتروالی۔ لالی رؤں جاؤں تھی (رو رہی جاتی تھی) اور مور سنگھہ اپنا ماتھہ تھامے بیٹھا تھا۔ اور سگرے گاؤں کے بیربانی (عورت مرد) اکھٹے تھے۔ اور سب ہی کہیں تھے کہ لالہ تو ایسا کٹھور (سنگ دل) کیوں

ہوگیا ہے چھوری پر انیائے (ظلم) نہ کر۔ مور سنگھ کے ڈھور ڈنگر لے لے چھوری کی ٹوم کو نہ لے۔ اس کا سورا سنیگا تو کہیگا مور سنگھ نے چھوری کی ٹوم لے لی ہوگی۔ پر لالہ نے کسی کی نہ سنی۔ اور سگری ٹوم سنگوالی۔ اور جب لالہ ڈھوروں کو لے چلا تو مور سنگھ کا چھوٹا چھورا اپنی گؤ (گائے) کو چپٹ گیا۔ وہ کہے تھا میں اپنی گؤ تجھ کو نہیں دوں گا۔ یہ میرے دودھ پینے کی ہے۔ اور تاؤ لال سنگھ نے مجھے دی تھی جب وہ لڑائی سے آیا تھا اور گھنے روپے لایا تھا۔ پر لالہ نے مور سنگھ کے چھورے کو ایسا دھکیہ دیا کہ چھورا دور جا پڑا۔ اور لالہ نے کہا میں کیا جانوں لال سنگھ کون ہے مور سنگھ نے چھوری کے بیاہ پہ پانچ سو روپے لئے تھے دو برس ہوگئے نہیں دئے۔ نوتا بھی کھا گیا۔ کہتا تھا نوتہ کے روپے آئیں گے تو ہاتھ کے ہاتھ گنوا دوں گا۔ میں نوتہ کے دن چوپال میں بیٹھا رہا۔ ساڑھے تین سو روپے نوتہ کے آئے مگر مور سنگھ نے کہدیا کہ برات تین دن ٹھہر گئی چھ وقت کی روٹی دینی ہے برات چلی جائے تو ابھو جب دوں گا۔ برات کے بعد آیا تو بھی مور سنگھ نے کچھ نہ دیا۔ بیاج بٹہ مل کر ہجار (ہزار) روپے ہوگئے ہیں۔ لیتے وقت تو تم میں سے کسی نے کچھ نہ کہا اب تم سب کہتے ہو کہ انیائے نہ کر۔ میں اپنا روپیہ چاہتا ہوں یا انیائے کرتا ہوں یہ کہہ کر لالہ سب ٹوم اور ڈھور لے کر چلا گیا۔ اور یہ بھی کہتا گیا کہ لال سنگھ آئے تو کہدینا کہ وہ بہت ڈینگ مارا کرتا ہے کہ میں لام پر گیا تھا اور تھانہ دار تحصیل دار میرا خیال کرتے ہیں اب میں اس کے گاؤں سے یہ ٹوم اور ڈنگر لے جاتا ہوں اس سے کچھ ہو سکے تو میرا بگاڑ لے۔

چودھری لال سنگھ نے اپنی بیوی کی کہی ہوئی یہ حکایت بیان کر کے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور کہا کہ اس بنیہ نے چلتے چلتے مجھے ایسی بات کہی ہے کہ اگر مور سنگھ کے ڈنگر اور اس کی چھوری کی ٹوم الٹی نہ لاؤں تو میرا نام لال سنگھ نہیں۔

کیوں رے مور سنگھ تو نے اس کے روپے کیوں نہیں دئے تھے۔ اگر روپے دیدیتا تو سگرے گاؤں کی لاج ایک بنیہ یوں خراب نہ کرتا۔ تیری لالی کے سا سرے والے کیا کہیں گے کہ لال سنگھ اتنا بڑا آدمی وہاں تھا پھر بھی ان کی بہو کی ٹوم بنیہ نے اتار لی۔ اس بنیہ نے میری ناک

کاٹ ڈالی۔ اور میرے گاؤں کی عزت بھی خاک میں ملادی۔

لال سنگھہ کی یہ باتیں سُن کر مور سنگھہ بولا۔ چودھری تو جو کہے ٹھیک ہے۔ برات کے شکرانہ میں خرچہ زیادہ ہوگیا اور نوتہ کے سب روپے خرچ ہو گئے۔ میں بنیہ کو کہاں سے دیتا لال سنگھہ نے کہا۔ میں کہوں تھا زمیندارہ بنک سے روپیہ لے لے وہاں یہ لوٹ کھسوٹ نہیں ہوتی مگر نہیں مانا اور کہنے لگا کہ لالہ اجاگر مل پیڑیوں کے ساہوکار ہیں اور ہمارے پُرکھوں (باپ دادا) کے وقت سے لین دین اس کے ہاں ہوتا آیا ہے۔ اچھا میں کل تڑکے تحصیل میں جاؤں گا۔ اور لالی کی ٹوم اور تیرے ڈھور چھڑا لاؤں گا۔ اپنے چھورے سے کہدے کہ اس کی گؤ بھی آجائے گی جو میں نے اُس کو دی تھی۔

مور سنگھہ نے کہا چودھری تو ہمارا باپ ہے تو ہماری کھبر (خبر) نہ لیگا تو کون لے گا۔ مجھے تو چھوری لالی کا بڑا دُکھ ہے وہ ٹوم لے جانے کے بعد سے برابر رُوں جائے ہے اور کہے ہے کہ میں تو کوئیں میں ڈوب مروں گی اور سسرال نہیں جاؤں گی وہاں لوگ کہیں گے کہ اس کے باپ نے ٹوم لے لی ہوگی۔ ایسی لاج کی بات سُننے سے تو مرجانا اچھا ہے۔

لال سنگھہ نے کہا۔ جا ابھی لالی کو کھبر دیدے کہ میں تڑکے اس کی ٹوم لینے جاؤں گا وہ کسی بات کی چنتا (فکر) نہ کرے۔

یہ بات ختم ہوئی تو ایک بڈھے جاٹ نے حقہ دوسرے جاٹ کی طرف سرکایا اور کہا لے بے حقہ پی۔ حقہ ہر کالا ڈلا۔ سب کا رکھے مان۔ بھری سبھا میں یوں پھرے جو گوپین میں کان۔ (حقہ خدا کا پیارا ہے سب کو خوش کرتا ہے بھرے جلسہ میں اس طرح چکر لگاتا ہے جیسے کنہیا جی گوپیوں میں چکر لگایا کرتے تھے) پھر کہا۔ بھرلے مُکہ مارلے گھونٹ بہتا چھاگئی چاروں کھونٹ (حقہ بھر اور اس کا ایک کش لے ساری دُنیا دُکھ میں مبتلا دکھائی دیتی ہے) ایک جاٹ بولا کیوں بے رے من سُکھہ تیرے بیل مارٹے (دُبلے) کیوں ہوتے جاتے ہیں۔ من سُکھہ نے کہا۔ چارہ بھی خوب دوں ہوں۔ ٹہل بھی گھروالی بہت کرے ہے پر کسی نے کچھہ ایسا کیا ہے کہ بیل سوکھے

ہی چلے جائیں ہیں۔ ابھی گنگا جی کے میلہ پر گئے تھے تو جاڑے سے نہ تھکے۔

لال سنگھ نے بات کاٹ کر کہا۔ یہ جو نیا لاٹ آیا ہے اُس نے آتے ہی دلی میں کہا کہ میری شادی کو پچیس برس ہو گئے اور میں نے آج تک روٹی نہیں دی۔ کل ساری دلی کے ہندو مسلمانوں کو میری طرف سے روٹی کھلا دو۔ لاٹ کے نوکروں نے یہ حکم سنتے ہی کھانے پکوانے شروع کر دئیے اور دوسرے دن ہزاروں آدمیوں کو کھانا کھلایا گیا۔ مور سنگھ نے یہ بات سُنی تو کہا کیوں چودھری کہیں لاٹ نے اجاگر مل سے روپیہ لے کر تو کھانا نہیں کیا تو کل دلی جائے تو لاٹ سے کہہ دیجیو کہ اجاگر مل کے بہی کھاتہ سے چوکس (ہوشیار) رہے یہ ایک کے ڈیوڑھ لکھ لیتا ہے۔ لال سنگھ نے کہا۔ پاگل ہوا ہے لاٹ صاحب کو لالہ سے روپیہ لینے کی کیا ضرورت ہے وہ تو بنک سے روپیہ لیتے ہیں۔

ایک جاٹ نے کہا۔ کیوں چودھری کہیں ہیں کہ دیبی نے ایسا پرکاش کیا ہے اور ایسا چمتکار دکھایا ہے کہ ایک آدمی اپنے گھر کے اندر بیٹھ کر بات کرتا ہے یا گانا گاتا ہے تو ہزاروں کوس تک سب چھوٹے بڑے اس کی آواز کو اور بات کو سن لیتے ہیں۔

لال سنگھ نے کہا۔ اس کو ریڈیو کہتے ہیں اس میں دیبی کی کوئی بات نہیں ہے آکاش میں جو بجلی ہوتی ہے وہ آواز کو ہر جگہ لے جاتی ہے۔ نئے لاٹ نے حکم دیدیا ہے اب یہ ہمارے گاؤں میں بھی لگ جائے گی۔ اور ہم بھی گھر بیٹھے ساری دُنیا کے گانے اور باتیں سُن لیا کریں گے۔

پھر لال سنگھ نے کہا۔ لاٹ صاحب یہ چاہیں ہیں کہ گاؤں کے گریب (غریب) مانسوں (آدمیوں) کی سیوا کریں اور اس کارن انھوں نے ریڈیو بھی گاؤں در گاؤں لگانے کا حکم دیا ہے۔ وہ ہم کو اپنے گھر صاف رکھنے اور کپڑے اور بدن صاف رکھنے کی باتیں بتائیں گے اور کھیت کیار کی باتیں بھی بتائیں گے۔

ایک جاٹ بات کاٹ کر بولا۔ مگر لالہ لوگوں سے ہمارے کھیتوں اور گھروں اور ڈھور ڈنگروں

کو بھی بچائیں گے یا نہیں۔ ہمیں تو سب سے زیادہ ان لالہ لوگوں کا دُکھ ہے۔
لال سنگھ نے جواب دیا۔ گھبراؤ نہیں سرکار سب سے پہلے تمہارے قرضہ کا فکر کرے گی پھر گاؤں کے نائی کی طرف دیکھ کر کہا جو دُور بیٹھا باتیں سُن رہا تھا کیوں رے مکھن تو دلی کی اچھوت سبھا میں ہمارے گاؤں کے چوڑے چماروں کو بھی لے جانا چاہے ہے۔ یاد رکھیو اگر تو نے ان کو بگاڑا تو تجھے اس گاؤں میں رہنا مشکل ہو جائیگا۔
مکھن نائی نے کہا۔ نہیں چودھری تم سے یہ کسی نے جھوٹ کہا ہے اچھوت سبھا کے کوئی سادھو اچھوتا نند آئے تھے وہ چوڑوں چماروں کو نیوتہ دے گئے ہیں میرے گھر بھی آئے تھے۔ میں نے کہا میں نائی ہوں عزت دار آدمی ہوں چوڑوں چماروں کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ چماروں نے بھی یہی جواب دیا کہ ہم چوڑوں کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ ہاں مہتر سب جانے کو کہتے ہیں۔
یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک بھاٹ آگیا اور اس نے چودھری لال سنگھ کی تعریف میں گیت سُنانے شروع کئے۔ اور کہا۔ جب چودھری لال سنگھ کھاٹ پر بیٹھ کر حقہ ہاتھ میں لیتے ہیں تو بے جان حقہ ان کے ہونٹوں کے پاس جاکر بولنے لگتا ہے اور گڑگڑ کر کے اپنا دکھ ان کو سناتا ہے۔ اور وہ اس کا دکھ بھی ایسا ہی دور کرتے ہیں جیسے وہ اپنے گاؤں اور آس پاس کے سب گاؤں والوں کے دکھ دُور کرتے ہیں۔ ان کی کھاٹ لال قلعہ کا تخت ہے۔ وہ بھرت پور کے راجہ سورج مل کی اولاد ہیں جن کی آواز سُن کر شیر بھاگ جاتے تھے لال سنگھ کے گھر میں کبھی چولھا ٹھنڈا نہیں ہوتا دور دور کے کھانے والے ہر وقت جمع رہتے ہیں اور کھاتے ہیں۔
لال سنگھ بھاٹ کی یہ تعریف سُن کر خوش ہوئے اور حکم دیا کہ اس بھاٹ کو گڑ کی ایک بھیلی اور پانچ سیر گیہوں دیدو۔ اس کے بعد سب جاٹ چوپال سے چلے گئے اور گھروں میں جا کر سو گئے۔ اور دوسرے دن چودھری لال سنگھ نے لالہ سے فیصلہ کرا دیا۔

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کی تقریر

کربلا کی آخری رات

جو ۹ محرم ۱۳۵۶ھ مطابق ۲۳ مارچ ۱۹۳۷ء کی رات کو ہوئی

آج محرم کی ۹ تاریخ ہے ہندوستان کی ہر چھوٹی بڑی آبادی میں اور دُنیا کے اُن سب مقامات پر جہاں مسلمان آباد ہیں۔ حضرت امام حسینؑ کے غم میں مجلسیں ہو رہی ہیں۔ تعزیوں کے جلوس نکل رہے ہیں۔ اور عورت مرد اور بچے کربلا کے دردناک واقعہ کو یاد کرکے رو رہے ہیں۔ جو لوگ محرم کی حقیقت کو نہیں جانتے اُن کو آگاہ کرنے کے لئے اتنا لکھ دینا کافی ہے۔ کہ کربلا ملک عراق یعنی مسوپٹیمیا میں شہر بغداد کے قریب فرات دریا کے کنارہ ایک مقام ہے جہاں مسلمانوں کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سگے نواسہ حضرت امام حسینؑ کو اور ان کے ۷۲ ساتھیوں کو جن میں اُن کے بھائی اور بچے اور کنبہ دار اور غلام تھے۔ تین رات دن بھوکا پیاسا رکھ کر یزید کی فوج نے قتل کر دیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ حضرت امام حسینؑ نے یزید کو بادشاہ ماننے سے انکار کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ یزید اسلام کی تعلیم کے خلاف چلتا ہے اور یزید کو مسلمانوں کی عام رائے نے بادشاہ نہیں بنایا۔ بلکہ وہ زور اور طاقت سے رائے عامہ کے خلاف بادشاہ ہو گیا ہے اس لئے اس کی بادشاہت اسلام کے خلاف ہے۔

یزید امیہ کا پڑپوتا تھا۔ اور حضرت امام حسینؑ امیہ کے سگے بھائی ہاشم کے پڑپوتے تھے۔ گویا دونوں ایک دادا کی اولاد تھے۔ حضرت امام حسینؑ کے باپ حضرت علیؑ تھے۔ اور ماں حضرت فاطمہؑ محمد رسول اللہؐ کی بیٹی تھیں۔

یزید کی فوج کا سپہ سالار ابن سعد تھا۔ جو سعد وقاصؓ کا بیٹا تھا۔ اور سعد وقاص وہ مشہور سپہ سالار تھے جنہوں نے دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ کے حکم سے ایران فتح کیا تھا۔ حضرت امام حسینؑ کی بیوی

شہنشاہ ایران یزدگرد کی بیٹی حضرت شہر بانو تھیں۔ جو مسلمانوں اور ایرانیوں کی لڑائی کے وقت ایران کے پائہ تخت مدائن سے اپنے باپ شہنشاہ یزدگرد کے ساتھ مقام حلوان جا رہی تھیں کیونکہ مسلمانوں نے پائیہ تخت پر قبضہ کر لیا تھا۔ راستہ میں سعد وقاصؓ کے بھیجے ہوئے ایک افسر ابن عتبہ نے حضرت شہر بانو کو ان کی محافظ فوج کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ کیونکہ شہر بانو اپنے باپ کی فوج سے پیچھے رہ گئیں تھیں۔ اور ان کی محافظ فوج کم تھی۔

ابن عتبہ شہر بانو کو عزت کے ساتھ اسلامی سپہ سالار سعد وقاصؓ کے سامنے لایا۔ اور سعدؓ وقاصؓ نے حضرت عمرؓ کے پاس ان کو مدینہ میں بھیجدیا۔ اور حضرت عمرؓ نے اُن کی شادی رسول اللہ کے نواسہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ کر دی۔

کربلا کی لڑائی میں حضرت امام حسینؑ کے سب بچے قتل ہوگئے۔ مگر شہر بانو کے ایک بیمار لڑکے زین العابدینؓ زندہ بچے تھے۔ ان ہی سے امام حسینؑ کی نسل چلی۔ جو ہندوستان میں سید کہلاتی ہے۔ اور باہر کے ملکوں میں شریف کے نام سے مشہور رہے۔

اسلامی دُنیا میں صرف ایران ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں شیعہ مسلمان بہت زیادہ ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ کی نسل شہنشاہ ایران یزدگرد کی بیٹی شہر بانو سے چلی تھی۔

سید بھی اس بات پر فخر کرتے ہیں۔ کہ ان کے دادا امام حسینؑ رسول اللہ کے نواسہ اور شہنشاہ ایران کے داماد تھے۔ اور ان میں عربی اور ایرانی خون شریک ہے۔

کربلا کی آخری رات کربلا کا خونی ڈرامہ ۱۰ محرم کو ہوا تھا۔ اور ۹ محرم کو آخری رات تھی۔ جب کہ امام حسینؑ اور اُن کے ۷۲ ساتھی ہزاروں یزیدیوں کے محاصرہ میں تین دن کے بھوکے پیاسے رات بھر جاگے تھے۔

اسی آخری رات کا ذکر ہے کہ عورت مرد نماز اور عبادت سے فارغ ہوئے تو پچھلی رات کو حضرت شہر بانو نے اپنی ایرانی لونڈی شیریں سے باتیں کرنی شروع کیں۔ شیریں نے کہا کیوں بیوی وہ رات یاد ہے؟ جب کہ تمہارے والد شہنشاہ یزدگرد فوج کے ساتھ حلوان کی طرف جانے

لگے تو تم کو میں نے بہت جگایا مگر تمہاری نیند ایسی غفلت کی تھی کہ تم نہ جاگیں اور مجبوراً ہمارے محافظوں کو شہنشاہ کا ساتھ چھوڑنا پڑا۔ اور وہ تمہاری حفاظت کے لئے حلوان نہ گئے اور شہنشاہ یہ کہہ کر چلے گئے کہ سونے دو۔ نہ جگاؤ۔ صبح جب بیدار ہو تو لے آنا۔ اور سورج نکلنے سے پہلے ابن عتبہ کی فوج نے ہم کو گھیر لیا اور ہمارے محافظوں کو مار ڈالا۔ اور ہم کو گرفتار کر لیا۔

شہر بانو نے جواب دیا۔ ہاں شیریں مجھے سب کچھ یاد ہے میری اُسی رات کی نیند نے میرے باپ اور میرے ملک کی عزت تباہ کر دی۔ اور میں قیدی بن کر سعد وقاصؓ کے پاس آئی۔ یہ وحشی اور جنگلی لوگ تھے۔ مگر انہوں نے شریف اور مہذب لوگوں کا سا برتاؤ کیا۔ اور ہم مسلمانوں کے شہنشاہ عمرؓ کے پاس مدینہ میں بہت آرام سے پہنچائے گئے۔ شیریں نے کہا۔ اور بیوی وہ بات بھی یاد ہے کہ جب ابن عتبہ کی فوج ہمارا سامان لوٹ رہی تھی۔ تو ان کو تمہارے محافہ کا جڑاؤ کام حیرت زدہ کر رہا تھا۔ اور وہ جواہرات کی چمک دمک کو اس طرح دیکھتے تھے گویا اُنھوں نے پہلے کبھی جواہرات نہ دیکھے تھے۔ شہر بانو نے جواب دیا۔ ہاں شیریں وہ میرے محافہ کی رنگ آمیزی اور مینا کاری کو جھک جھک کر دیکھتے تھے۔ اور عربی زبان میں خبر نہیں کیا کیا کہتے تھے۔

نام } حضرت امام حسینؑ کی بہن حضرت زینب نے کہا۔ کیوں بانو اس رات اور آج کی رات میں کیا فرق ہے؟ شہر بانو نے جواب دیا۔ اُس رات میں شہنشاہ ایران کی بیٹی تھی۔ اور خالص ایرانی تھی۔ اور میرا نام شہ زن اور شہ ران تھا۔ اور آج کی رات میں مسلمانوں کے شہنشاہ اور رسولؐ کے نواسہ کی بیوی بھی ہوں اور مجھے عربوں سے رشتہ کا فخر بھی حاصل ہے۔ اور دُنیا میں جہاں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے اور جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں وہ سب اور ان کی عورتیں اور ان کے بچے مجھے اپنی ملکہ مانتے ہیں۔ اگر میرے باپ کی حکومت قائم رہتی تو میں صرف ایران کی شہزادی کہلاتی۔ مگر آج ایران اور خراسان اور افغانستان اور مصر اور شام اور عراق اور حجاز وغیرہ سب ملکوں کی ملکہ ہوں۔ اور میرے شوہر پر ہر مسلمان عورت مرد اپنی نمازمیں پانچوں وقت درود پڑھتا ہے۔ اور مجھ پر بھی کہ آل محمدؐ ہوں۔

حضرت زینب نے پوچھا کیوں شہریان اور شہرزن تم کو وہ وقت بھی یاد ہے۔ جب تم خلیفہ عمرؓ کے سامنے قید ہو کر آئی تھیں۔ اس وقت کی کوئی بات یاد ہو تو کہو۔ شہربانو نے کہا۔ کہ ہم سب قیدیوں کی صورت میں کھڑے تھے۔ اور میرے باپ کا خزانہ خلیفہ عمرؓ کے سامنے ڈالا جا رہا تھا۔ جب میرے باپ کے دربار کا فرش لایا گیا۔ تو جواہرات کی چمک سے ان سب کی آنکھوں میں چکا چوند ہو گئی۔ اور اس فرش کی تقسیم پر آپس میں بحث کرنے لگے۔ اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس قیمتی فرش کو کیوں کر تقسیم کریں۔ تو انہوں نے اس کو کاٹ ڈالا۔ اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے بانٹ دیا۔ اور بعد میں مجھے معلوم ہوا۔ کہ اس فرش کا ایک ایک ٹکڑا بیس بیس ہزار اشرفی کو بکا۔ شیریں نے کہا اور بیوی وہ بھی یاد ہے کہ تمہارے باپ کی پوشاک ایک عرب کو پہنائی گئی تھی۔ شہربانو نے کہا۔ ہاں۔ ابن رواحہ ایک عرب مسلمان کو میرے باپ کی شاہانہ پوشاک پہنائی گئی اور اس کے سر پر تاج رکھا گیا اور سب مسلمانوں نے دیر تک ابن رواحہ کو دیکھا۔ تب خلیفہ عمرؓ نے ایک عبرت ناک تقریر کی اور کہا دیکھو یہ زمانہ کا انقلاب ہے۔ خدا نے قرآن مجید میں کہا ہے۔ کہ خدا دنیا میں اسی طرح انقلاب پیدا کرتا رہتا ہے۔ جو لوگ اس دنیا اور اس کے کر و فر کے دھوکہ میں آ جاتے ہیں اور اس کی شان و شوکت پر فریفتہ ہو کر خدا کو اور انقلاب کو بھول جاتے ہیں۔ ان کا یہ انجام ہوتا ہے۔

پھر خلیفہ عمرؓ نے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے کو دس ہزار درہم دئے۔ اور عثمانؓ کو جو عمرؓ کے بعد خلیفہ ہوئے تھے۔ دس ہزار درہم دئے۔ اور میرے شوہر اور ان کے بھائی کو بیس بیس ہزار درہم دئے۔

اور جب خلیفہ عمرؓ کے بیٹے عبداللہؓ نے اسی مجمع میں کہا۔ اے باپ مجھ کو بھی میرا حصہ دیجئے تو خلیفہ عمرؓ نے اپنے بیٹے کو ایک ہزار درہم دئے اور کہا ہر ایک کی خدمت کی موافق اس کو حصہ دیا جائیگا۔ اے شیریں مجھ پر خلیفہ عمرؓ کی اس بات کا بڑا اثر ہوا کہ وہ کیسا بے غرض بادشاہ ہے۔ کہ دوسروں کو زیادہ دیتا ہے اور اپنے بیٹے کو اتنا کم دیتا ہے۔

شیریں نے کہا اے بیوی وہ بھی سناؤ۔ جب کہ تمہارے زیورات اتارنے کا مشورہ ہوا۔

شہر بانو نے کہا۔ ہاں میرے بدن پر بہت قیمتی زیورات تھے۔ اور ہجوم ان زیورات کو دیکھ رہا تھا۔ آخر ایک شخص آگے بڑھا۔ اور اس نے میرا زیور اُتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ تو میں نے ایک دو ہتڑ اس کے سینہ پر مارا اور کہا۔ دور رہو میرے پاس سے میں ایران کے شہنشاہ کی بیٹی ہوں۔ تم مجھ کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ تب ایک دوسرا آدمی مجھے کوڑا مارنے کے لئے آگے بڑھا۔ تو میرے شوہر کے باپ علیؑ نے ڈانٹ کر کہا " خبردار ہاتھ نہ اُٹھائیو۔ عورت پہ ہاتھ اُٹھانا اسلام میں جائز نہیں ہے۔ پھر خلیفہ عمرؓ سے علیؑ نے خطاب کیا۔ اور کہا اے عمرؓ مجھ سے رسول اللہؐ نے فرمایا تھا۔ کہ جب کسی قوم کا سردار ذلیل اور مغلوب ہو کر تمہارے پاس آئے تو تم اس کی عزت کرنا پس یہ لڑکی ایران کے شہنشاہ کی بیٹی ہے اس کی عزت ہم سب مسلمانوں پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی بموجب ضروری ہے۔

خلیفہ عمرؓ نے جواب دیا۔ ہاں لے علیؑ تم سچ کہتے ہو میں اس لڑکی کی پوری عزت کروں گا۔ اور اس کی شادی ایسے شخص سے کروں گا جو ہم سب کے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیارا ہے اور جس کو ہم نے دیکھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس کا مُنہ چومتے تھے۔ اور اپنے کندھے پر بٹھاتے تھے۔ اور اپنی زبان اس کے منہ میں دیتے تھے اور وہ تیرا بیٹا حسینؑ ہے اور ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام ہیں۔ اور ان کے محبوب نواسہ کے بھی غلام ہیں۔ اور رسول اللہؐ کا پیارا نواسہ ہم سب کا آقا ہے۔ اس کے بعد میرا حسینؑ بن علیؑ کے ساتھ نکاح کر دیا گیا۔

لڑائی یہ عورتیں یہ باتیں کر رہی تھیں کہ صبح کی نماز کا وقت ہو گیا۔ اور سب نے نماز پڑھی۔ پھر حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھی اور اُن کے بھائی اور اُن کے لڑکے لڑائی کے لئے ہتھیار لگا کر باہر میدان میں چلے گئے۔

شہر بانو کی لونڈی شیریں کا بیان ہے کہ اس دن گرمی بہت سخت تھی۔ اور ہم سب پر دشمن نے پانی بند کر دیا تھا۔ اور ہم نے تین رات دن سے پانی نہ پیا تھا۔ اور بچے پیاس سے تڑپتے تھے شہر بانو کی گود میں ڈیڑھ سال کا ایک بچہ علی اصغر پیاس سے بہت روتا تھا۔ دوپہر کو جب بہت سے آدمی قتل ہو چکے۔ اور حسینؑ لڑائی کے میدان سے اپنے جوان بیٹے علی اکبرؑ کی لاش خیمہ میں لائے۔ اور خیمہ

ہیں عورتیں اس خوبصورت اٹھارہ سالہ جوان کو خون میں نہایا ہوا دیکھ کر رو رہی تھیں۔ اور علی اکبرؑ کی
ماں ام لیلیٰ لاش کے سرہانے کھڑی کہہ رہی تھیں۔ دیکھو میرے دولہا کو اس کی چھاتی پر برچھی ماری ہے
میرے اس لال کی شکل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کتنی مشابہ ہے۔ ان سنگ دل یزیدیوں نے
میرے لال کو مارتے وقت یہ خیال بھی نہ کیا۔ کہ یہ اُن کے رسولؐ کا ہم شکل ہے۔

تو شہربانو نے اپنے شوہر حسینؑ سے کہا۔ کہ دشمن کے لشکر کا سردار وقاصؓ فاتح ایران کا بیٹا عمر سعد ہے
سعد وقاصؓ نے میری گرفتاری کے وقت میری عزت کی تھی۔ اس کا بیٹا بھی میری عزت کا خیال کریگا
تم میرے اس دودھ پیتے بچہ کو لے جاؤ۔ اور کہو کہ اس بچہ نے یزید اور اس کی فوج کا کوئی گناہ نہیں کیا
اس کا پانی کیوں بند کیا ہے۔ اس کو تو پانی دیدیں۔ حسینؑ نے جواب دیا میں اپنے دشمن سے کوئی چیز
اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے نہیں مانگوں گا۔ ہاں حجت تمام کرنے کے لئے جاتا ہوں تاکہ دنیا دیکھ لے
کہ میں مظلوم ہوں۔ اور دشمن ظالم ہے۔ یہ کہہ کر علی اصغرؑ کو گود میں لیا۔ اور عمر سعد کی فوج کے سامنے کھڑے
ہوئے اور بلند آواز سے کہا اے سعد وقاصؓ کے بیٹے یہ شہنشاہ ایران کا نواسہ اور میرا بیٹا ہے اور تین
دن سے پیاسا ہے۔ کیا تم مسلمان ہو۔ اور کیا تم کو اسلام نے رحم اور بچوں سے ہمدردی نہیں سکھائی؟
یہ بچہ معصوم ہے اس کا پانی کیوں بند کیا ہے؟ اگر تمہارے اندر اسلام کے رحم کا کچھ بھی اثر ہے تو اس
کا ثبوت دو۔ اور اس بچہ کو پانی پلا دو۔ یہ تقریر سُن کر ابن سعد تو خاموش کھڑا رہا۔ مگر اس کے ایک سپاہی
نے ایک تیر بچے کی طرف چلایا۔ جس نے بچہ کے حلق کو چھید ڈالا۔ اور بچہ باپ کی گود میں تڑپ کر مر گیا۔
اور حسینؑ اس بچہ کی لاش کو گود میں لئے ہوئے خیمہ میں آئے۔ اور بچہ کی لاش شہربانو کی گود میں دیدی
شہربانو نے خیال کیا کہ بچہ کو پانی دیدیا گیا ہے اور وہ سو گیا ہے۔ اس لئے انہوں نے خوش ہو کر
کہا۔ کیا اس کو نیند آگئی؟ بہت پیاسا تھا۔ پانی پیتے ہی سو گیا۔ سعد وقاصؓ کے بیٹے نے اپنے باپ کی
طرح شرافت کا ثبوت دیا۔ اور شہنشاہ ایران کے نواسہ اور علیؑ و فاطمہؑ بنت رسول اللہؐ کے پوتے کو پانی پلا
مگر جب انہوں نے بچہ کو گود میں لیا۔ اور اس کو خون میں نہایا ہوا دیکھا۔ اور اس کے سر کے لمبے
لمبے بال خون میں تر دیکھے۔ تو بے اختیار اُن کے مُنہ سے ہائے نکلی۔ اور انہوں نے کہا۔ کاش میرا باپ زندہ

ہوتا۔ اور اُس کی حکومت باقی ہوتی۔ اور کاش بچہ کا دادا زندہ ہوتا جس نے خلیفہ عمرؓ کے سامنے میری حمایت کی تھی۔ اور کاش میرا شوہر ایرانیوں کو خبر دیدیتا اور ان کو اپنی مدد کے لیئے بلا لیتا۔

میرا بچہ میرا لال۔ ہائے اُس کو مار ڈالا۔ اس کو تیر کی نوک کا پانی پلایا۔ مجھے کیا خبر تھی یہ یزیدی ایسے سنگ دل ہیں۔ میں اس کو میدان میں نہ بھیجتی۔

امام حسینؑ نے کہا۔ بانو صبر کرو۔ خدا نے قرآن مجید میں کہا ہے کہ ہم آدمی کو جان و مال کے نقصان سے آزماتے ہیں۔ تاکہ معلوم ہو کہ آدمی حق اور سچائی کے کام میں ثابت قدم رہتا ہے یا نہیں؟ آج ہم سب نے دیکھ لیا۔ کہ دُنیا اور حکومت اور دولت کی حرص و ہوس نے ان مسلمانوں کی آنکھیں بند کر دی ہیں۔ اور عمرؓ خلیفہ دوئم نے ایران کی فتوحات کو سامنے دیکھ کر جو کچھ کہا تھا۔ کہ دولت آدمی کو غافل کر دیتی ہے۔ وہ ہو بہو سامنے نظر آ رہا ہے۔

میں حق اور صداقت پر قائم ہوں اور میرا دل ان سخت امتحانوں میں مضبوط ہے۔ تم بھی شہنشاہ ایران کی بیٹی ہو اور ایک بڑی مصیبت اپنے باپ کی بربادی کی برداشت کر چکی ہو آج بھی اس مصیبت میں صبر کرو۔

خیمہ کی لُوٹ ؎ دس محرم کی سہ پہر کو جب سب قتل ہو چکے اور حضرت امام حسینؑ بھی شہید ہو چکے تو ابن سعد کی یزیدی فوج حضرت امام حسینؑ کے خیمہ میں گھس گئی اور اس نے خیمہ کا سامان لوٹا۔ اور خیموں میں آگ لگا دی۔ اور عورتوں کے سروں سے چادریں بھی چھین لیں۔

لیکن جب ایک یزیدی سپاہی نے حضرت شہر بانو کے سر سے چادر اتارنی چاہی۔ تو انہوں نے ڈانٹ کر کہا دور رہو۔ میں مسلمانوں کی ملکہ ہوں۔ میں شہنشاہ ایران کی بیٹی ہوں۔ خلیفہ عمرؓ کے سامنے جب تم نے میرا زیور لینا چاہا تھا تو علیؓ نے تم کو روکا تھا۔ آج تم نے علیؓ کی اولاد کو خاک و خون میں ملا دیا۔ تو کیا ہوا۔ علیؓ کا خدا میری حفاظت کرے گا۔ یہ سُن کر وہ دشمن ہٹ گیا۔ اور امام حسین کے بیمار لڑکے زین العابدینؑ کو قتل کرنے کے لیئے آگے بڑھا۔

تب زینبؓ اور شہر بانو دوڑیں۔ اور زین العابدینؑ کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ زینب نے کہا یہی ایک بچہ باقی رہ گیا ہے اس کو بھی مار ڈالو گے تو حسینؑ کی نسل ختم ہو جائے گی۔ ہم اس کو نہ مارنے دیں گے

پہلے ہم کو مار ڈالو۔ تب اس بچہ کو مارو۔ ابن سعد نے کہا۔ اچھا چھوڑ دو۔ اور ان سب کو قید کر لو۔
سپاہیوں نے پہلے بیمار لڑکے زین العابدینؑ کے ہاتھوں میں رسی باندھی۔ پھر حسینؑ کی چھوٹی لڑکی سکینہ کے ہاتھوں میں رسی باندھی۔ پھر سب عورتوں کے ہاتھوں میں رسیاں باندھیں۔ اور جب شہر بانو کے ہاتھ میں رسی باندھنے لگے تو انہوں نے کہا۔ یاد کرو۔ اُس وقت کو جب تمہارے باپ سعد وقاصؓ نے مجھے گرفتار کیا تھا۔ تو میرے محافہ کا پردہ بھی نہ کھولا تھا۔ اور پوری عزت کے ساتھ مجھے خلیفہ عمرؓ کے پاس مدینہ میں لائے تھے۔ آج تم میری اتنی بے عزتی کیوں کرتے ہو۔ کیا اس لئے کہ میرا باپ زندہ نہیں ہے۔ اور میرے باپ کی حکومت نہیں ہے۔ اور میرے شوہر کو تم نے مار ڈالا ہے۔ اور میرا کوئی وارث باقی نہیں چھوڑا ہے۔ ڈرو خدا سے کہ وہ تمہارے اس ظلم کو دیکھ رہا ہے۔ ابن سعد نے کہا۔ تیرے شوہر نے یزید کی بادشاہی سے انکار کیا۔ اُس کو اس کی سزا ملی۔ اب تم سب کو یزید کے دربار میں لے جائیں گے یزید کے گورنر ابن زیاد کا حکم ہے۔ کہ حسینؑ کی عورتوں کو رسیاں باندھ کر اور بے چادر اونٹوں پر بٹھا کر بازاروں میں پھراؤ۔ تاکہ سب دیکھیں کہ بادشاہ وقت سے سرکشی کرنے والوں کا یہ انجام ہوتا ہے۔
چنانچہ سب عورتوں کو رسیاں باندھ کر ننگی پیٹھ کے اونٹوں پر سوار کیا گیا۔ اور بیمار لڑکے زین العابدینؑ کو بھی اونٹ پر اسی طرح سوار کیا گیا۔ اور کوفہ کے بازار میں جہاں یزید کے گورنر ابن زیاد کا پایہ تخت تھا پھرایا گیا۔ آگے آگے شہیدوں کے سر نیزوں پر تھے۔ اور پیچھے قیدیوں کے اونٹ تھے۔ اسی طرح یہ قیدی منزل بہ منزل دمشق میں پہنچائے گئے۔ جہاں یزید کا پایہ تخت تھا۔ یزید نے ان کو ایک تنگ و تاریک قیدخانہ میں بند کر دیا۔ اور دوسرے دن اپنے سامنے بھرے دربار میں بلایا۔ امام زین العابدینؑ راستہ کی تکلیف اور گزشتہ بیماری کے سبب بہت کمزور ہو گئے تھے۔ عورتیں بھی یزید کے دربار میں صف بنا کر کھڑی کی گئیں۔ اور امام حسینؑ کا کٹا ہوا سر سونے کے ایک لگن میں یزید کے سامنے رکھا گیا۔ یزید نے اپنی چھڑی امام حسینؑ کے سر کے دانتوں کو لگائی۔ اور کہا۔ اس شخص کے دانت کس قدر خوب صورت تھے۔
یہ حالت دیکھ کر ایک مسلمان نے چیخ کر کہا۔ جو دربار میں کھڑا تھا۔ اے یزید اپنی چھڑی ہٹا کے

خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تھا۔ کہ وہ اپنے اس نواسہ کے ہونٹوں اور دانتوں کو چومتے تھے۔ آج تو اس جگہ پر چھڑی مارتا ہے۔ تجھ کو شرم نہیں آتی۔

پھر زینب سے مخاطب ہو کر یزید نے کہا۔ دیکھا اپنے بھائی کی ضد کا انجام؟

زینب نے جواب دیا۔ ہاں دیکھا۔ اور اب اس ظلم کا انجام دیکھنا باقی ہے۔ جو میرے بھائی پر ہوا۔

پھر شہر بانو سے کہا تیرا خاوند چاہتا تھا کہ میرا ملک مجھ سے چھین لے۔ شہر بانو نے جواب دیا۔ ملک کا مالک اللہ ہے۔ جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے۔ تو ایران پر بھی قابض ہے۔ مگر ایران میرے باپ کا ملک تھا۔ اور اس کی حکومت میرے شوہر کا حق تھی۔ جس پر تو نے ناحق قبضہ کر لیا ہے۔

پھر یزید نے امام زین العابدینؑ سے کہا۔ تیرے باپ سے میری قرابت تھی۔ ہم اور وہ ایک دادا کی اولاد ہیں۔ میں نہ چاہتا تھا کہ تیرے باپ کو قتل کیا جائے۔ یہ ابن زیاد گورنر کوفہ کی زیادتی ہے۔ کہ اس نے تیرے باپ کو مار ڈالا۔

اے لڑکے حکومت کا یہی دستور ہوتا چلا آیا ہے کہ اس کے لئے ماں باپ اور اولاد اور کنبہ والوں کی رعایت نہیں کی جاتی۔ پس جو کچھ ہوا حکومت کے لئے ہوا۔ اب میں تم کو آزاد کرتا ہوں جاؤ تم مدینہ میں جا کر رہو۔ اگر تم نے بھی اپنے باپ کی طرح میری حکومت کا مقابلہ کیا تو میری تلوار تم کو ٹھیک کر دیگی۔ ورنہ تم ہمیشہ امن سے زندگی بسر کرو گے۔ امام زین العابدین نے جواب دیا میرے باپ نے جو کچھ کیا حق کیا۔ اور حق کے لئے کیا۔ اور حق ادا کر دیا۔ اور میں نے بھی ناحق کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ آئندہ وہی ہوگا جو حق کے حامی خدا کو منظور ہوگا۔

بہادر شاہ کے حلال خور کا قصہ

۴؍ اپریل ۱۹۳۷ء کو حضرت خواجہ حسن نظامی نے ریڈیو میں سنایا

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے چند سال پہلے کا ذکر ہے کہ آخری مغل شہنشاہ ابوظفر بہادر شاہ لال قلعہ کے دیوان خاص میں بیٹھے تھے۔ کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب کے حاضر ہونے کی خبر چوب دار لایا۔ جہاں پناہ نے فرمایا۔ حکیم جی کو آنے دو۔

بادشاہ دیوان خاص کے برابر والے دالان میں مسند تکیہ سے لگے بیٹھے تھے۔ سامنے پیچوان حقہ رکھا تھا اور قریب ہی ملکہ زینت محل بیگم صاحبہ بیٹھی تھیں۔

حکیم صاحب بادشاہ کے سامنے آئے تو جھک گئے اور سات دفعہ فرش کو ہاتھ لگا کر سلام کیا بادشاہ نے فرمایا۔ آؤ حکیم جی رات کو مجھے نیند نہیں آئی۔ ذرا نبض تو دیکھو۔

حکیم صاحب نے پھر سلام کیا اور ادب سے نبض دیکھنے کو ہاتھ بڑھایا۔ اور نبض دیکھی۔ پھر نسخہ تجویز کیا۔ اور اُسی وقت چوب دار شاہی دواخانے سے دوا لے آیا۔ جس کو پہلے حکیم صاحب نے خود کھایا۔ تاکہ بادشاہ کو یہ شبہ نہ ہو کہ دوا میں کوئی زہریلی چیز ملی ہوئی ہے۔ اِس کے بعد بادشاہ کے سامنے دوا پیش کی۔ بادشاہ نے دوا کھا کر فرمایا۔ "حکیم جی تم نے سُنا۔ میرے حلال خور درباری نے اپنے لڑکے چندہ کا پیغام ریزیڈنٹ کے حلال خور کی لڑکی کے لئے بھیجا تھا۔ مگر اس نے جواب دیا کہ وہ عیسائی ہو گیا ہے۔ اس واسطے اپنی لڑکی چندہ کو نہیں دے سکتا۔ ہاں اگر چندہ بھی عیسائی ہو جائے تو شادی کر دی جائے گی۔

حکیم صاحب نے دست بستہ ہو کر یعنی دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ حضور فدوی نے بھی یہ حال سُنا تھا۔ اور درباری حلال خور سے تفصیلی حالات بھی معلوم کئے تھے۔ واقعہ اسی طرح ہے جس طرح جہاں پناہ نے ارشاد فرمایا۔

بادشاہ نے کہا۔ تو تم ریزیڈنٹ کے حلال خور کو سمجھاؤ کہ وہ شاہی حلال خور کا پیغام رد نہ کرے کیونکہ اس سے ابد دولت کی توہین ہوتی ہے۔ کہ ہمارے حلال خور کے لڑکے کا پیغام رد کر دیا گیا۔ پھر ارشاد کیا کہ اچھا چوبدار جائے اور درباری کو بلا لائے۔

تھوڑی دیر میں درباری حاضر ہوا۔ لال مخمل کا چوغہ پہنے ہوئے۔ سر پر مندیل (پگڑی) بندھی ہوئی اور اس میں مور کا پر لگا ہوا۔

دور سے اُس نے فارسی کے اشعار پڑھ کر بادشاہ کو دعائیں دیں۔ اور دونوں ہاتھ باندھ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔

بادشاہ نے حکیم جی کو اشارہ کیا۔ اور حکیم صاحب نے پوچھا۔ کیوں درباری تیرے لڑکے کا پیغام ریزیڈنٹ کے حلال خور کے ہاں کب گیا تھا۔ اور اُس نے کیا جواب دیا تھا؟

درباری حلال خور نے کہا۔ جان کی امان پاؤں تو جو گزری ہے حرف بہ حرف پیش کر دوں۔

حکیم صاحب نے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ بادشاہ نے ہوں کر دی۔ حکیم صاحب نے کہا جہاں پناہ نے تیری جان تجھ کو بخشی۔ کہہ جو تو کہنا چاہتا ہے۔

درباری ذرا آگے بڑھا اور دونوں ہاتھ جوڑے۔ کمر اور گردن کو ذرا جھکایا پھر کہنے لگا۔

اقبال و جلال جہاں پناہ تا ابد قائم رہے۔ کمترین کو خبر نہ تھی کہ ریزیڈنٹ کا مہتر کرسٹان ہو گیا ہے غلام زادہ چندہ نے اُس کی لڑکی کو کسی شادی میں دیکھ پایا تھا۔ گھر میں آیا تو اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ گیا اُس کی ماں نے بہت پوچھا نہ بتایا۔ مجھے خبر ہوئی۔ میں گھبرایا ہوا گیا۔ اُس کے سر کو اپنے زانو پر رکھا پیار کیا۔ اور حال پوچھا۔ مگر اس نے مجھ سے بھی دل کی بات نہ کہی۔ آخر اس کے ایک ہم جولی لڑکے کو بلایا۔ جو شادی میں ساتھ گیا تھا۔ اور الگ لے جا کر ماجرا دریافت کیا تو اُس نے کہا چندہ نے بنا کی لڑکی لالی کو دیکھا ہے۔ اور ایک دل ہزار جان سے اُس پر فریفتہ ہو گیا ہے اور کہتا ہے کہ جب تک لالی سے شادی نہ ہو گی نہ دانہ کھاؤں گا نہ پانی پیوں گا۔

یہ خبر سنکر فدوی بنا حلال خور کے پاس گیا۔ اور اُس سے چندہ کے رشتہ کی بات کی۔ بنا نے

پوچھا چندہ نے کچھ پڑھا ہے۔ فدوی نے جواب دیا۔ ہاں گلستان بوستاں تک تعلیم پائی ہے استاذ ذوق سے غزل میں اصلاح لی ہے۔ میرا ایک ہی بچہ ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی لڑکا ہے نہ لڑکی۔

پنا نے میری تنخواہ پوچھی۔ میں نے جواب دیا۔ جہاں پناہ کے صدقہ سے خدا نے سب کچھ دیا ہے۔ ایک روپیہ مہینہ تنخواہ ہے۔ عید بقر عید اور نوروز پر طلائی کڑے اور جوڑے ملتے ہیں۔ ہر مہینہ شاہی مسہل کے وقت چاندی کے کڑے اور دو شالہ مرحمت ہوتا ہے۔ اور دونا دہلی شہر کے نیارے جو سونے چاندی کو صاف کرنے کا کام کرتے ہیں وہ شاہی پاخانہ سات روپے کا روزانہ خرید کر لے جاتے ہیں۔ کیونکہ حضور جہاں پناہ معجونوں میں جو طلائی ورق نوش فرماتے ہیں۔ وہ سونا نیارئے پاخانہ سے نکال لیتے ہیں۔ اور اس وقت میرے گھر میں دو لاکھ روپے کے کڑے موجود ہیں۔ اور دو لاکھ روپے کے جوڑے اور دو شالے بھی جمع ہیں

پنا نے کہا۔ مگر تمہاری تنخواہ تو بہت کم ہے یہ انعام اکرام تو عارضی ہیں۔ تنخواہ اصل چیز ہے اور وہ فقط ایک روپیہ ماہوار ہے۔ مجھے ریزیڈنٹ صاحب پندرہ روپے مہینہ دیتے ہیں اور بڑے دن پر ایک پرانا کوٹ پتلون اور دو روپے نقد بھی دیتے ہیں۔ اس واسطے میں اپنی لڑکی لالی کا رشتہ تمہارے لڑکے سے نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ تم لال بیگی حلال خور ہو۔ اور میں عیسائی ہو گیا ہوں۔ میرا تمہارا رشتہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد شاہی حلال خور نے رو کر کہا۔ بس حضور یہ قصہ اس فدوی کا ہے جس دن سے یہ انکار ہوا ہے چھندہ کی حالت غیر ہے۔ نہ کھاتا ہے نہ سوتا۔ بس اس کو رات دن رونا ہے چہرہ زرد ایسا کہ ہلدی کھنڈی ہوئی ہے۔ ہونٹ خشک ہیں ہر وقت ٹھنڈے سانس لیتا ہے۔ میری اور اپنی ماں کی جان کھوتا ہے۔

جہاں پناہ نے حکیم صاحب کو پھر کچھ اشارہ کیا۔ اور حکیم صاحب نے درباری سے کہا۔ جا دربار ی میں پنا کو بلا کر ابھی رشتہ کا انتظام کر دیتا ہوں۔

چنانچہ حکیم صاحب نے پنا کو بلا کر سمجھایا۔ اور ریزیڈنٹ صاحب کو بھی لکھا۔ اور انھوں نے

بھی اپنے حلال خور کو رشتہ کی فہمائش کی اور منگنی قرار پائی۔

چندہ بیٹھنے کے بعد کا ذکر ہے کہ ایک دن چندہ اُستاد ذوق کے پاس گیا اور کہا کہ دلی کے سب نوجوان لڑکے علم مجلسی سیکھنے کو طوائفوں کے ہاں جاتے ہیں اس لئے میں نے بھی جوئی طوائف کے ہاں نشست کی اطلاع بھیجی تھی اُس نے جواب دیا کہ حلال خور کا لڑکا امراء اور شرفاء کے ساتھ کیونکر بیٹھ سکتا ہے۔

اُستاد ذوق نے کہا۔ تو جب اپنے باپ کا کام نہیں کرتا۔ اور پاک صاف رہتا ہے اور عملاً مسلمان ہے تو تجھ کو اعلیٰ مجلسوں میں جانے سے کون روک سکتا ہے۔ میں جوئی کو کہلا بھیجوں گا۔

چنانچہ اُستاد ذوق نے جوئی کو کہلا بھیجا۔ اور چندہ جوئی کے ہاں جانے لگا۔

ریزیڈنٹ کے حلال خور بنا کی لڑکی لالی جوئی کے ہاں کماتی تھی۔ یعنی جوئی کے ہاں صفائی کا کام کرتی تھی۔ مگر چندہ چونکہ شام کے وقت جوئی کے ہاں جاتا تھا۔ اور لالی صفائی کے لئے صبح جاتی تھی۔ اس لئے کبھی لالی نے چندہ کو جوئی کے ہاں نہ دیکھا تھا۔ اور جوئی کو بھی خبر نہ تھی کہ لالی کا رشتہ چندہ سے ہو چکا ہے۔

ایک دن صبح کے وقت لالی کمانے آئی تو اُس نے ہنس کر جوئی سے کہا کیوں بی کبھی تم کو کسی سے محبت بھی ہوتی ہے۔ جوئی نے کہا۔ ہم بازاری لوگ ہیں۔ محبت ہمارے ہاں کہاں ہم تو فرضی محبت کی باتیں بنا کر لوگوں کو فریب دیتے ہیں۔ ہاں ایک حلال خور زادہ چندہ کی صورت اور آواز مجھے بہت پسند ہے جب وہ یہاں دوستوں میں بیٹھ کر غزل پڑھتا ہے یا گاتا ہے تو میں اپنا گانا بھی بھول جاتی ہوں۔ غضب کی آواز اُس نے پائی ہے۔ اور خوش کلامی کا تو یہ عالم ہے کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ جب سے چندہ نے یہاں آنا شروع کیا ہے میرا دل ہر وقت بے قرار رہتا ہے۔ مگر میں اپنی محبت ظاہر نہیں کر سکتی کیونکہ یہ بات دستور اور رواج کے خلاف ہے۔ ہم بازاری عورتوں کے ہاں جو لڑکے علم مجلسی سیکھنے آتے ہیں اُن سے کوئی بازاری عورت ناجائز تعلق نہیں کر سکتی۔ نہ لگاؤ کے اشارہ کنایہ کی بات ہی کر سکتی ہے۔ ورنہ پھر ہمارے ہاں

شرفا زادے کبھی بھی نہ آئیں۔ کیونکہ یہ بات بہت معیوب ہے اور ہم سب لوگ دستور اور رواج کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے۔

چندہ کا نام سن کر لالی شرما گئی۔ اور چپ ہو گئی۔ جوئی نے حیران ہو کر کہا۔ کیا تو چندہ کو جانتی ہے لالی نے کہا۔ ہاں اس سے میری منگنی ہو چکی ہے۔ یہ بات سن کر جوئی دل میں جل گئی۔ مگر اس نے ظاہر داری کا سدھا منہ بنا کر کہا۔ کہ لالی تو بڑی خوش نصیب ہے۔

دوسرے دن جب لالی جوئی کے ہاں آئی تو جوئی نے اس کو مٹھائی دی۔ اور کہا رات کو چندہ یہ مٹھائی لایا تھا۔ میں نے بھی کھائی تو بھی کھائیو۔

لالی وہ مٹھائی لے کر گھر گئی اور اس نے وہ مٹھائی کھالی۔ کھاتے ہی اس کو قے ہوئی اور تھوڑی دیر میں دو چار قے ہونے کے بعد مر گئی۔ کیونکہ جوئی نے زہر ملا کر مٹھائی دی تھی۔

لالی کے مرنے کی خبر درباری اور چندہ کو بھی ہوئی تو چندہ نے اپنا گریبان پھاڑ ڈالا۔ اور بہت رویا۔ اور پھر روزانہ لالی کی قبر پہ جا کر رویا کرتا تھا۔ اور غم کے گیت گایا کرتا تھا۔

لالی کی قبر ایک نالہ کے کنارے تھی۔ برسات میں سیلاب آیا تو قبر نالہ میں گر پڑی۔ اور لالی کی ہڈیاں نالہ کے ایک غار میں دب گئیں۔

اس زمانہ میں برف کا رواج نہ تھا۔ اس لئے کمہار لوگ سردی کے موسم میں جب اولے برستے تھے تو جہاں اولے جمع ہوتے تھے وہاں سے مٹی اٹھا کر لاتے تھے اور برتن بناتے تھے اور گرمی کے موسم میں بڑی بڑی قیمتوں پہ وہ برتن فروخت کرتے تھے۔ کیونکہ اولوں کی مٹی کے برتنوں میں پانی بہت ٹھنڈا ہوتا تھا۔

ایک شام کا ذکر ہے۔ چندہ حلال خور جوئی کے مکان میں بیٹھا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ کالی گھٹا آسمان پر چھائی ہوئی تھی۔ بادل گرج رہا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی۔ چندہ نے جوئی سے کہا آج تو شراب پینے کا دن ہے۔ جوئی نے یہ سن کر اپنے نوکر سے کہا۔ جا کمہار کے ہاں جا۔ اور اولوں کی مٹی کے بنے ہوئے برتن خرید لا۔ کیونکہ شراب اولوں کی مٹی کے بنے ہوئے برتنوں میں بہت

اچھی معلوم ہوگی۔

نوکر بازار گیا۔ اور ہونٹوں کی مٹی سے بنی ہوئی ایک صراحی اور دو چار جام یعنی آبخورے خرید لایا۔ جوئی نے اُن کو دھویا۔ اور پانی ملا کر شراب صراحی میں بھری اور ایک جام بھر کر چندہ کو دیا۔ چندہ نے جام اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ مگر اُس نے ایک گھونٹ بھی شراب کا نہ لیا تھا کہ ایک غیبی آواز مکان کی چھت سے آئی اور اُس آواز نے یہ شعر پڑھا۔

پس مردن بنائے جائیں گے ساغر مری گل کے　　لب جاں بخش کے بوسے ملیں گے خاک میں مل کے

اس آواز کو سُن کر جوئی نے گھبرا کر کہا۔ یہ تو لالی کی آواز ہے۔ لالی کا بھوت آیا۔ میں نے لالی کو زہر دیا تھا۔ لالی کا بھوت مجھ سے بدلہ لینے آیا ہے۔ یہ کہہ کر جوئی غش کھا کر گر پڑی اور تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ کیونکہ اُس کے دل پر خوف اور خون اور بھوت کا وہم اتنا زیادہ ہوا تھا کہ وہ اُس کو برداشت نہ کر سکی۔

چندہ بھی یہ آواز سُن کر نیم دیوانہ ہو گیا۔ اور جام کو ہاتھ میں لئے ہوئے دیوانہ وار لالی کی قبر پہ چلا گیا۔ اور وہاں بیٹھ کر لالی کا شعر گانے لگا۔ یعنی وہی شعر جو غیبی آواز سے سُنا تھا گاتا تھا اور کہتا تھا کہ میری لالی کے ہونٹوں کی مٹی سے یہ جام بنا۔ اور اُس کے ہونٹ مرنے کے بعد میرے ہونٹوں تک آ گئے۔

درباری نے اپنے لڑکے چندہ کا بہت علاج کرایا۔ مگر اس کے جنون میں کمی نہ ہوئی۔ اُس کا معمول تھا کہ روز سویرے لالی کی قبر پر چلا جاتا تھا۔ اور دن بھر وہاں گاتا تھا اور روتا تھا۔

یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کا بلوہ ہوا اور مئی ۱۸۵۷ء سے ستمبر ۱۸۵۷ء تک دہلی میں جل چل رہی آخر ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب انگریزی فوج دہلی میں داخل ہوئی اور دہلی کے باشندے شہر چھوڑ کر بھاگے تو لوگوں نے دیکھا کہ چندہ لالی کی قبر پہ بیٹھا ہے۔ اکتارہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور حضرت حافظ شیرازی کا یہ شعر گا رہا ہے اور اکتارہ بجا رہا ہے۔

عاقبت از مظہر سبو ساغر و رانیز ہم کنند　　کس نکشد روز گشا یہ حکمت اہل معمار را

بھاگنے والوں نے چندہ کو آواز دی کہ ارے او چندہ بھاگ گوروں کی فوج آرہی ہے وہ تجھ کو مار ڈالیں گے ۔

چندہ نے بے پروائی سے جواب دیا ۔ جاؤ جاؤ تم زندہ ہو تو اپنی جان بچاؤ ۔ میں تو مر چکا ہوں جس دن میری لالی مری اُسی دن میں مرا ۔ پھر مرا ہوا آدمی اپنی جان کیا بچائے گا ۔ اور مرے ہوئے کو کون مارنے آئے گا ۔

بس یہ تھا گزشتہ زمانہ کی ایک صحبت کا حال جیتے رہے تو ۲۲ اپریل کو ایسی ہی ایک کوئی اور سنائیں گے ۔

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کی ریڈیو تقریر

۲۳ اپریل ۱۹۳۷ء

غدر سے پہلے کے چند

دلّی والوں کے حلیے

ستر اسی برس پہلے کے زمانہ کی صحبتوں کا ایک قصہ پہلے سنا چکا ہوں۔ آج بہادر شاہ بادشاہ کے زمانہ میں جو مشہور لوگ دلی میں رہتے تھے اُن کا قصہ سناتا ہوں۔ جس سے اُن کی صورتوں اور لباسوں کا تھوڑا بہت اندازہ ہوجائے گا۔ اس بیان میں کچھ تو میری ذاتی معلومات ہے اور کچھ جناب میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی کی کتاب آخری شمع سے اقتباسات ہیں جنہوں نے بڑی محنت کرکے بہت سے حلیے مشاہیر کے کتاب مذکور میں جمع کئے ہیں۔ اور جو بالکل سچے اور ٹھیک ہیں

بہادر شاہ کا میانہ قد۔ دُبلا بدن۔ لمبوترا چہرہ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ لمبی گردن۔ پتلی ستواں ناک۔ بڑا دہانہ۔ گہری سانولی رنگت۔ سر منڈا ہوا۔ چھدری ڈاڑھی جو کلوں پر بہت کم۔ ٹھوڑی پر ذرا زیادہ۔ لبیں کتری ہوئی۔ ستر برس کی عمر میں بھی ڈاڑھی کے کچھ بال کالے تھے۔ چہرہ پر جھریاں تھیں۔ مگر آواز میں مرتے دم تک کرارہ پن رہا بولتے تھے تو سننے والا مرعوب ہوجاتا تھا۔

بھئی اماں تکیہ کلام تھا یعنی جب کسی سے بات کرتے تھے تو اماں کہہ کر بات شروع کرتے تھے جو ارے میاں کا مخفف تھا۔ جیسے کہ آجکل لکھنؤ کی بول چال ہے۔

لباس کمخواب کا پاجامہ جس کے پائنچے ایک بر کے ہوتے تھے یعنے ڈھیلا پاجامہ پہنتے تھے جس کی موریاں نہ غرارہ دار کی طرح زیادہ ڈھیلی تھیں نہ تنگ پاجامہ کی طرح چست۔ گرمیوں میں سفید ڈھاکہ کی ململ کا کرتہ۔ اس پر جامہ دار کی نیمہ آستین جس کو مغلوں کا چوغہ کہنا چاہیئے۔ سر پہ کارچوبی چوگوشیہ ٹوپی جو آج تک شہزادوں میں پہنی جاتی ہے۔

بہت تیز چلتے تھے۔ شاہانہ وقار کے سبب بولتے کم تھے ہونٹوں کے اشارہ سے اکثر باتیں سمجھاتے تھے دوسروں کے سامنے ہنستے نہ تھے۔ ہنسی کی بات ہوتی تو منہ پر رومال رکھ لیتے تھے اور یہ رواج اس زمانہ میں عام تھا۔ اور اردو میں محاورہ ہو گیا تھا کہ وہ منہ پر رومال رکھ کر ہنسے یعنی ان کو بہت زیادہ ہنسی آئی۔

میرزا فخرو} بہادر شاہ کے آخری ولی عہد تھے غدر سے ایک سال پہلے مر گئے تھے فخر الدین نام تھا۔ فتح الملک لقب تھا۔ وہابی عقیدہ تھا۔ باپ یعنی بہادر شاہ کی صورت سے بہت مشابہ تھے یعنی جو حلیہ بہادر شاہ کا تھا وہی ان کا تھا فرق صرف جوانی اور بڑھاپے کا تھا۔ ان کی شادی میرزا الٰہی بخش صاحب کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ ان کے دو لڑکے تھے میرزا خورشید عالم اور میرزا فرخندہ جمال میرزا فرخندہ جمال کے دو لڑکے زندہ ہیں۔ بڑے میرزا احمد شاہ خزانہ دہلی کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہیں۔

حکیم احسن اللہ خاں} بہادر شاہ بادشاہ کے طبیب خاص اور مشیر خاص گورا رنگ سفید بھری ہوئی ڈاڑھی گول چہرہ اس میں چیچک کے کچھ داغ آنکھوں میں ذہانت کی چمک سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنتے تھے۔ بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔

استاد ذوق} محمد ابراہیم نام تھا بہادر شاہ کے استاد تھے کابلی دروازہ کے پاس ان کا مکان تھا بہت چھوٹا سا صحن جس میں دو پلنگ بچھانے کی جگہ بھی مشکل سے ہوگی صحن میں بان کی کھری چارپائی پر بیٹھے حقہ پیا کرتے تھے۔ میانہ قد۔ رنگ گہرا سانولا چہرہ پر چیچک کے داغ بہت تھے آنکھیں بڑی بڑی اور روشن نگاہیں تیز۔ چہرہ کا نقشہ کھڑا کھڑا۔ سفید تنگ پاجامہ۔ سفید کرتا۔ اور سفید انگرکھا پہنتے تھے۔ سر پر ململ کی ٹوپی گول چندوے کی اوڑھتے تھے۔ ان کا مزار قدم شریف میں کلو بخشو کے تکیہ میں ہے جس کو حکیم حاجی عبد الحمید صاحب مالک دواخانہ ہمدرد دہلی نے ابھی حال میں بنوا دیا ہے۔

مرزا غالب} نواب اسد اللہ خاں مرزا نوشہ غالب نسل کے ترک بہت حسین اور خوش رو آدمی تھے قد اونچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا۔ موٹا موٹا نقشہ سرخ و سپید رنگ پچاس برس کی عمر

ہیں آگے کے دو دو دانت ٹوٹ گئے تھے ڈاڑھی بھری ہوئی تھی مگر گھنی نہیں تھی۔ سر منڈاتے تھے
اس پر سیاہ پوستین کی ایک لمبی ٹوپی پہنتے تھے۔ جو کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی تھی۔ ایک برکا سفید
پاجامہ اور سفید ململ کا انگرکھا اس پر ہلکے زرد رنگ کی جامہ وار کا چوغہ پہنتے تھے۔

نواب نیّر ریاست لوہارو کے رئیس نواب ضیاء الدین احمد خاں نام۔ اُردو شاعری میں تخلص
رخشاں اور فارسی میں نیّر مرزا غالب کے خلیفہ خاص تھے چھوٹا قد۔ گورا رنگ۔ نازک نازک
نقشہ غلافی آنکھیں چگی ڈاڑھی۔ چھریرا بدن ایک برکا سفید پاجامہ اور سفید ہی انگرکھا پہنتے تھے
قالب چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی اوڑھتے تھے ایک بڑا شالی رومال سمو سہ بنا کر شانوں پر ڈالتے تھے

نواب علائی لوہارو کے نواب صاحب کے ولی عہد تھے۔ میانہ قد۔ گندمی رنگ موٹا موٹا
نقشہ۔ گول چہرہ۔ شربتی آنکھیں اور گھنی اور چڑھی ہوئی ڈاڑہی غلطے کا تنگ مہری کا پاجامہ۔ سفید
جامدانی کا انگرکھا اس پر سینہ کھلی ہوئی سیاہ مخمل کی نیمہ آستین اور سر پر سیاہ مخمل کی چوگوشیہ
ٹوپی اوڑھتے تھے۔ غدر سے پہلے ایک انگریز کو مارنے کی سزا میں پھانسی پائی تھی۔

مولانا صہبائی امام بخش نام تھا صہبائی تخلص کرتے تھے۔ چیلوں کے کوچہ میں رہتے تھے کالج
میں پڑھاتے تھے۔ کھلا ہوا گندم گوں رنگ منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ سر پر پٹھے۔ بدن دُبلا
پتلا ایک برکا سفید پاجامہ اور سفید انگرکھا پہنتے تھے۔ اوپر کشمیری کام کا چوغہ ہوتا تھا اور سر پر چھوٹا سا
سفید عمامہ باندھتے تھے مرزا غالب کے خاص دوستوں میں تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں قتل
ہوئے کیونکہ کوچہ چیلاں کے سب مرد جمنا دریا کے کنارے قتل کئے گئے تھے۔ مرزا غالب نے
اپنے خطوط میں صہبائی کے مارے جانے کا جگہہ جگہہ دردناک الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

حکیم سید مومن خاں حضرت خواجہ میر درد رحمۃ کے خاندان میں تھے ان کے جداعلیٰ نواب
خان دوراں خاں پانی پت کے میدان میں نادر شاہ ایرانی کی فوج کے ہاتھ سے قتل ہوئے
تھے اور دوسرے دادا نواب روشن الدولہ نے چاندنی چوک دہلی میں سنہری مسجد بنوائی تھی
جس کے اندر بیٹھ کر نادر شاہ نے دلی والوں کے قتل عام کا حکم دیا تھا اور تین لاکھ ہندو مسلمان

قتل ہوئے تھے اور آصف جاہ نظام اول نے نادر شاہ سے کہہ سن کر دلی والوں کو امن دلایا تھا

حکیم مومن خاں حکیم آغا جان کے چھتے کے سامنے رہتے تھے۔ کشیدہ قامت سرخ و سپید رنگ بڑی بڑی روشن آنکھیں لمبی لمبی پلکیں کھنچی ہوئی بھویں۔ لمبی ستواں ناک۔ پتلے پتلے ہونٹ ان پہ پان کا لاکھا جما ہوا مسی آلود دانت ہلکی مونچھیں خشخاشی ڈاڑھی بھرے بھرے بازو پتلی کمر۔ چوڑا سینہ لمبی لمبی انگلیاں سر پہ گھونگر والے لمبے لمبے بال پشت اور شانوں پہ بکھرے ہوئے۔ کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کانوں کے آس پاس کنپٹیوں پہ بچھو کی ڈنک کی طرح مڑی ہوئی بدن پہ شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا جس کے نیچے کرتا نہ ہوتا تھا۔ اس لئے جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ ڈالے رہتے تھے اور اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ لٹکا رہتا تھا۔ کاکریزی رنگ کے ڈوپٹہ کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیتے تھے اور اس کے دونوں سرے سامنے لٹکا لیتے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت رکھتے تھے۔ پاؤں میں سرخ گلبدن کا پاجامہ مہریوں پر سے تنگ اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا کبھی کبھی ایک بر کا پاجامہ بھی پہنتے تھے مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئی جو کبھی لٹکی رہتی تھیں اور کبھی الٹ کر چڑھا لیتے تھے سر پہ گلشن کی دو پلڑی ٹوپی اس کے کنارے پر باریک لیس ٹوپی اتنی ٹیڑھی ہوتی تھی کہ سر پہ اچھی طرح منڈھ کر آ جاتی تھی مگر اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے اور نظر آتے تھے۔

مفتی صدر الدین خاں گداز جسم سانولا رنگ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئی۔ بھری ہوئی ڈاڑھی۔ بدن پر ایک بر کا سفید پاجامہ سفید کرتہ اور سفید ہی عمامہ۔ ٹٹیا محل کے پاس ان کا مکان اب بھی موجود ہے جو خان بہادر نواب ابوالحسن خاں صاحب کے قبضہ میں ہے

نواب شیفتہ مصطفیٰ خاں نام تھا۔ شیفتہ تخلص تھا ان کے بیٹے نواب اسحاق خاں صاحب رام پور کے وزیر اور علی گڑھ کالج کے سکریٹری تھے اور ان کے پوتے نواب محمد اسماعیل خاں

میرا اسمبلی یوپی میرٹھ میں رہتے ہیں۔ نواب شیفتہ کا رنگ گہرا سانولا تھا لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا۔ اس پر نیچی سیاہ گول ڈاڑھی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی جسم کسی قدر بھاری اور قد میانہ تھا۔ تنگ مہری کا سفید پاجامہ اور سفید کرتہ اور نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبہ نما چگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے

مشاعرہ کی محفل آج کی رات یہ چند حلیئے بیان کرکے غدر سے پہلے کے ایک مشاعرہ کا حلیہ بھی بیان کرتا ہوں کہ اُس زمانہ میں مشاعرہ کی محفلیں کیونکر آراستہ کی جاتی تھیں۔

شنیئے: جس مکان میں مشاعرہ ہونے والا ہوتا تھا وہاں سفیدی میں ابرک ملا کر قلعی کرائی جاتی تھی جس کی وجہ سے در و دیوار پڑے جگمگ جگمگ کرتے تھے۔ صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے جاتے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہو جاتے تھے تختوں پر دری اور اور چاندنی کا فرش اس پر قالینوں کا حاشیہ پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار چھت میں جھاڑوں۔ فانوسوں۔ ہانڈیوں۔ اور دیواروں پر قمقموں۔ دیوار گیریوں چینی قندیلوں اور گلدستوں کی آرائش ہوتی تھی سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ گنگا جمنی چوبوں پر سبز ریشمی طنابوں سے ایستادہ ہوتا تھا اس کے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند بچھے سبز کارچوبی گاؤ تکیہ سبز رنگ کی وجہ یہ تھی کہ دہلی کے بادشاہوں کا درباری رنگ سبز تھا شامیانے کی چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس کسے ہوئے فانوسوں کے کنول بھی سبز چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح لٹکے ہوئے بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتونی ڈوریوں سے جن کے سروں پر مقیش کے گچھے تھے اس طرح چوبوں پر کس دیا جاتا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے معلوم ہوتے تھے دیواروں میں جہاں کھونٹیاں ہوتی تھیں وہاں کھونٹیوں پر اور جہاں کھونٹیاں نہ ہوتی تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکائے جاتے تھے۔ اِس سرے سے اُس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشیے بھی سبز ہوتے تھے۔ کھچی ہوئی چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا جاتا تھا کہ پھولوں کی ایک

چھتری ہو جاتی تھی۔ ایک صحن چی میں پانی کا انتظام ہوتا تھا۔ کورے کورے گھڑے رکھے جاتے تھے اور شورے میں جست کی صراحیاں لگائی جاتی تھیں دوسری صحن چی میں پان بنائے جاتے تھے۔ باورچی خانہ میں حقوں کا تمام سامان سلیقہ سے جمایا جاتا تھا۔ جا بجا نوکر صاف ستھرے لباس پہنے دست بستہ مودب کھڑے رہتے تھے۔ تمام مکان مشک عنبر اور اگر کی خوشبو سے مہکتا تھا۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حقوں کی قطار ہوتی تھی حقے ایسے صاف ستھرے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی دکان سے منگائے ہیں۔ حقوں کے بیچ میں جو جگہ چھوٹ جاتی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھ کر ان پر خاصدان رکھ دئے جاتے تھے۔ خاصدانوں میں لال قند کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان کی گلوریوں کو صافی میں اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک تہہ خوشبودار پھولوں کی بچھی ہوئی تھی۔ خاصدان کی برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں ان میں الائچیاں اور چکنی ڈلیاں اور بھُن دھنیا مسند کے سامنے چاندی کے دو شمعدان۔ اندر کافوری بتیاں اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول شمعدان کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن لگنوں میں کیوڑا بھرا ہوا۔ جب مشاعرہ شروع ہوتا تھا۔ یہی شمعدان سب شعراء کے سامنے گردش کرتے تھے۔ اب یہ شمع رہی نہ شمعدان رہے۔ نہ محفل رہی نہ محفل والے رہے نہ پھول رہے نہ باغ رہے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

اونچے اونچے مکاں تھے جن کے بڑے	آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے	آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم	آج اس جا ہے آشیانہ بوم
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے	نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے	استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے
ذات معبود جاودانی ہے	باقی جو کچھ بھی ہے وہ فانی ہے
صبحدم طائران خوش الحان	پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

یہ تھا گزشتہ زمانہ کی صحبت کا حال جس کا ایک حصہ پہلے سنایا تھا ایک آج سنایا۔ جی میں پھر آئے گی تو پھر کبھی اجڑنے والی محفلوں کی تصویر قلم کی زبان پر نظر آجائیگی۔ سننے والے سنیں گے رونے والے روئیں گے اور تاریخ لکھنے والے جوان دونوں جھگڑوں سے الگ ہیں اپنی تاریخی یادداشت کو آراستہ کریں گے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کی تقریر

رسولؐ کی

دیا کریا

جو ۲۴ رمئی ۱۹۳۷ء کو بتقریب عید میلاد دلّی ریڈیو میں ہوئی

ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب دیش میں ایک مہا دیالو کا جنم ہوا تھا۔ جن کا نام محمدؐ تھا۔ اور جن کو مسلمان خدا کا رسول یعنی منُش اُدّہار کے لئے خدا کا بھیجا ہوا مانتے ہیں۔ آج ان کا جنم دن ہے۔ سارے سنسار میں جہاں جہاں مسلمان رہتے ہیں اُن کے جنم دن کی یاد میں سبھائیں کر کے اُن کے گُن گاتے ہیں۔ اس کارن آج دلی ریڈیو میں بھی مسلمانوں کے رسولؐ کے جیون سے دَیا کریا کی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ قرآن اپنشد پُستک میں سری محمدؐ جی کو سنسار بھر کیلئے رحمت آرتھات دَیالو کہا گیا ہے۔

شری مان محمدؐ جی مہاراج شمبل دیپ یعنی عرب دیش میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے پِتا کا نام عبداللہ تھا اور اُن کی ماتا کا نام آمنہ تھا۔ اُن کی جاتی کا نام قریش تھا جو عرب دیش کے لوگوں میں برہمن سَمان مانے جاتے تھے۔ مہا دَیالو ماتا کے گرب (حمل) میں تھے کہ اُن کے پِتا عبداللہ کی مرتیو ہو گئی تھی۔ اور جب یہ پانچ برس کے ہوئے تو اُن کی ماتا بھی دُنیا سے سدھار گئی تھیں۔ پہلے اُن کو اُن کے دادا نے پالا پھر چچا نے پالا۔ اُن کے پیدا ہوتے ہی عرب دیش کے رواج انوسار ایک گاؤں میں دائی حلیمہ کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ جنہوں نے اُن کو دودھ پلایا۔ اور جب انہوں نے ہوش سنبھالا۔ تو اپنی دائی کی بکریاں چرانے لگے۔ مہا دیالو نے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا۔ کارن یہ کہ اُس سمے عرب دیش میں کوئی بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔

مہادیالو پچیس۲۵ برس کی اوستا تک بہت نیکی کا جیون بسر کرتے رہے اور پچیس۲۵ برس کی اوستا میں چالیس برس کی ودھوا عورت خدیجہؓ سے ان کا بیاہ ہوگیا۔ خدیجہؓ بہت روپیہ والی عورت تھیں اور اُن کے ہاں بیوپار ہوتا تھا۔ اس کارن مہادیالو نے بھی بیوپار کرنا شروع کیا اور دُور دُور کے ملکوں میں بیوپار کرنے گئے۔ وہ مکہ شہر میں پیدا ہوئے اور مکہ کے بازار میں اُن کی دُکان تھی ایک دن انھوں نے بازار میں دیکھا کہ ایک اندھی عورت جا رہی ہے رستہ میں وہ عورت ٹھوکر کھا کر گری تو بازار کے لوگ اُس کے گرنے پر ہنسنے لگے۔ مہادیالو نے یہ حال دیکھا تو وہ اپنی دکان سے اُتر کر اُس عورت کے پاس گئے اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ پھر ہنسنے والوں سے کہا کہ کسی اندھی عورت یا مرد کی ہنسی کرنی مہا پاپ ہے۔ اگر ایشور تمہاری آنکھوں کی جوت بھی لے لے تو تمہارا بھی یہی حال ہو جائیگا۔ پھر اُس اندھی عورت کا ہاتھ پکڑ کر اس کے گھر تک ساتھ گئے اور اس سے پوچھا کہ تو بازار میں کیوں آئی تھی اُس عورت نے کہا نہ میرا کوئی پتی ہے نہ میری سنتان (اولاد) ہے میں ایک باغ کی رکھوالی کرنے جاتی ہوں اور وہاں سے مجھے کھانے کو مل جاتا ہے۔ مہادیالو نے کہا تو اپنے گھر میں بیٹھی رہ میں تجھ کو پکا پکایا بھوجن دے جایا کروں گا۔

پھر مہادیالو اپنی استری خدیجہؓ کے پاس گئے اور اُن سے کہا "اے آنکھوں والی اُن کی لُٹیا پکا جن کی آنکھیں نہیں ہیں۔ اور اے اولاد والی اور اے پتی والی اُن پر دیا کر جن کے پتی نہیں ہیں اور جن کے اولاد نہیں ہے اور جن کا کوئی سہایک نہیں ہے" مہادیالو کی استری خدیجہؓ نے اُتر (جواب) دیا۔ میں ہر سیوا کے لئے موجود ہوں۔ پھر اُنھوں نے روٹی پکا کر دی اور مہادیالو نے اُس اندھی عورت کو روٹی پہونچائی اور پھر ہمیشہ دونوں وقت خود اس کو روٹی پہنچاتے تھے اور پانی بھی اُس کے گھر میں خود ہی بھر دیتے تھے اور پوچھتے تھے کہ بہن اور سیوا بتا۔

ایک دن مہادیالو اپنی دُکان پر بیٹھے تھے کہ اُنھوں نے دیکھا کہ ایک مزدور عورت لکڑیاں

سر پر رکھے جا رہی ہے اور وہ جوان ہے اور بازار کے بُرے آدمی اُس کو چھیڑ رہے ہیں یہ کہہ کر مہادیا لو لوگوں کے پاس گئے اور کہا کہ ہر عورت کو اپنی ماں اور بہن اور بیٹی سمجھو۔ اور جو عورت تمہارے شہر میں رہتی ہے وہ تو تمہاری ماں اور بہن اور بیٹی کی برابر ہے

ایسے ہی ایک دن ایک آدمی بازار میں ایک عورت کو مار رہا تھا۔ مہادیا لو نے اُس آدمی کو روکا تو اُس آدمی نے اُتر دیا کہ یہ میری استری ہے میں جو چاہوں کروں تم کو روکنے کا کوئی ادھیکار نہیں ہے۔ مہادیا لو نے کہا "مجھ کو اور ہر مرد کو ادھیکار ہے کہ عورت جاتی کو دُکھ سے بچائے۔ اگر تو پھر کبھی اپنی استری کو مارے گا تو میں تجھ کو مکہ سے نکال دوں گا۔

جس سمے مہادیا لو مکہ میں تھے اُس سمے عرب میں آدمیوں کا بیوپار ہوتا تھا یعنی عورت مرد لونڈی غلام بنائے جاتے تھے۔ ایک دن مہادیا لو نے ایک گھر میں دیکھا کہ ایک غلام چکی سے آٹا پیس رہا ہے اور روتا جاتا ہے۔ مہادیا لو اس غلام کے پاس گئے اور اس کے رونے کا کارن پوچھا۔ غلام نے کہا میں روگی (بیمار) ہوں اور میری شکتی بہت کم ہوگئی ہے۔ مجھ سے چکی چل نہیں سکتی مگر میرا مالک بڑا ہی انیائی (ظالم) ہے۔ وہ کہتا ہے تیری کیسی ہی دشا (حالت) ہو تجھکو چکی ضرور پیسنی پڑے گی۔ یہ سُن کر مہادیا لو اُس غلام کے پاس بیٹھ گئے۔ اور اس کو چکی کے پاس سے ہٹا دیا۔ اور خود چکی چلا کر اس کا آٹا پیس دیا۔ اور جب تک بندھو (غلام) اُس روگ سے اچھا نہ ہوا روز اُس کے پاس جاتے تھے اور اس کا آٹا پیس دیتے تھے۔

مہادیا لو کی استری خدیجہؓ کے پاس ایک عیسائی بندھو تھا۔ ایک دن مہادیا لو نے اپنی استری سے کہا کہ اگر تو چاہتی ہے کہ تیری آتما کو شانتی ہو تو اس بندھو سوتنتر کر دے۔ بیوی خدیجہؓ نے اُتر دیا کہ میں آپ کی ہر آگیا (حکم) کا پالن کروں گی اور اُسی سمے اُس بندھو کو آزاد کر دیا۔ بیوی خدیجہ پتی سیوا اور پتی آگیا پالن کرنے میں بہت اونچی تھیں۔

یہ سب باتیں جو بیان کی گئیں اس سمے کی ہیں جب کہ مہادیا لو کو ایشور نے اپنا اوتار

نہیں بنایا تھا کیونکہ وہ رسولؐ چالیسؔ برس کی اوستا (عمر) میں ہوئے تھے اور یہ سب باتیں پچیس برس کی اوستا سے چالیس برس کی اوستا تک کی ہیں۔ جب وہ چالیسؔ برس کی عمر میں خدا کے رسولؐ ہوگئے تب تو اُن کی دَیا کرپا اَدھک (بہت) بڑھ گئی۔ اور چالیس برس کی عمر سے ترسیٹھ برس کی عمر تک وہ رات دن نُنش سیوا میں لگے رہتے تھے اور پیچ مچ دَیا اوتار ہوگئے تھے۔

مکہ میں ایک بڑا امیر آدمی رہتا تھا جس کا نام ابوسُفیان تھا اُس امیر آدمی کے ہاں بہت سے لونڈی غلام تھے اور ابوسُفیان ان لونڈی غلاموں سے بڑے کٹھن کام لیتا تھا اور ان لونڈی غلاموں کو کھانا کپڑا بہت کم دیتا تھا۔ اور اُن کے دُکھوں میں سہائتا (مدد) نہ کرتا تھا۔ ایک رات مُہا دَیا لو نے سُنا کہ ابوسفیان کا ایک غلام تین دن سے بیمار ہے اور کوئی اس کو پانی پلانے والا بھی نہیں ہے اُس سمے عرب دیش میں دیا جلانے کی ریتی نہ تھی۔ سب لوگ رات کو اندھیرے میں رہتے تھے۔ مُہا دَیا لو رات کے اندھیرے میں ابوسُفیان کے بندھو کے پاس گئے۔ تو دیکھا کہ وہ بیچارہ ایک جھونپڑی میں مٹی کے بچھونے پر پڑا ہے۔ مُہا دَیا لو اُس کے پاس بیٹھ گئے۔ اور اُس کے پاؤں دبانے لگے۔ اندھیرے میں غلام پہچان نہ سکا کہ میرے پاؤں کون دباتا ہے اور اُس کو خیال آیا کہ شاید میرے مالک ابوسُفیان نے کسی غلام کو میری سیوا کے لئے بھیجا ہے اس کارن اُس غلام نے کہا "کیا تجھ کو میرے مالک نے بھیجا ہے" مُہا دَیا لو نے اُتّر دیا کہ ہاں تیرے مالک نے مجھے بھیجا ہے کہ میں تیری سیوا کروں تو بھوکا ہو تو روٹی کھلاؤں تو پیاسا ہو تو پانی پلاؤں اور تیرے پاؤں دباؤں۔ غلام نے کہا "تو جا میرے لئے روٹی لا اور پانی لا"۔ مُہا دَیا لو اپنے گھر گئے اور غلام کے لئے روٹی اور پانی لائے اور جب اُس نے روٹی کھالی اور پانی پی لیا تو وہ لیٹ گیا اور کہا "آ میرے پاؤں دبا"۔ مُہا دَیا لو نے اُتّر دیا "جو آگیا" اور اُس کے پاؤں دبانے لگے۔ آدھی رات بیت جانے کے بعد غلام نے کہا "تو کہاں کا رہنے والا ہے

تو میرے پاؤں اچھے نہیں دباتا۔ میں اپنے مالک سے کہوں گا کہ تو نے میری اچھی سیوا نہیں کی جیسی سیوا میں اپنے مالک کی کرتا ہوں تو بھی ایسی ہی کر۔ اور جیسے میرا مالک میری سیوا کے سمے مجھ پر کرودہ (غصہ) کرتا ہے اور مجھے مارتا ہے تو میں بھی تجھ پر کرودہ کروں گا اور ماروں گا اور تجھ کو وہ سہن کرنا ہوگا۔ مہادیالو نے کہا اگر تیرا مالک سیوا کرنے کے بعد بھی تجھ کو مارتا ہے تو بُرا کرتا ہے تو اپنے مالک کی بُری باتوں کی ریس نہ کر۔ تاکہ ایشور تجھ کو غلامی سے چھڑا دے کیونکہ میں آدمیوں کو بُری باتوں سے بچانے آیا ہوں۔

جب ساری رات بیت گئی اور اُجالا ہو گیا تو اس غلام نے دیکھا کہ پاؤں دبانے والا تو مکہ کا سب سے بڑا سردار ہے جس کو لوگ ایشور کا رسولؐ اور اوتار سمجھتے ہیں تو وہ ڈر گیا اور اُس نے ہاتھ جوڑ کر شمہ مانگی۔ مہادیالو نے ہنس کر کہا۔ گھبرا مت میں بھی اپنے مالک کا غلام ہوں اور اسی کارن میں نے رات کو کہا تھا کہ تیرے مالک نے مجھے بھیجا ہے کیونکہ تیرا اور میرا مالک ایک ہی ہے۔ اور وہ ایشور ہے تو اگر ایک ایشور کو مان لے اور مجھے ایشور کا رسولؐ مان لے تو تیری سپھلتا (نجات) ہو جائیگی۔ وہ غلام یہ بات سنتے ہی مسلمان ہو گیا اور جب ابوسفیان نے یہ بات سُنی تو اس کو بہت کرودھ آیا۔ کیونکہ ابوسفیان اس مہادیالو کا رشتہ دار تھا اور بڑا شترو (دشمن) تھا۔ وہ بھاگا ہوا مہادیالو کے پاس آیا اور کہا کہ تو نے میرے غلام کو بگاڑ دیا تو نے اس کے پاؤں دبائے اب وہ میرے کام کا نہیں رہا۔ تو اس کی قیمت مجھے دے اور اس کو لیجا کیونکہ وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ میں مسلمان کو اپنی سیوا میں نہیں رکھ سکتا۔ مہادیالو نے ہنس کر کہا کہ اے ابوسفیان سب آدمی برابر کے بھائی ہیں اور جو ایک دوسرے کی سیوا کرتے ہیں یہ ایک طرح کا بیوپار ہے۔ پرنتو اگر تو اس کو رکھنا نہیں چاہتا تو مانگ اس کا مول کیا مانگتا ہے وہ غلام بازار کے بھاؤ پانچسو روپیہ کا تھا مگر ابوسفیان نے ایک ہزار روپے مانگے۔ مہادیالو اپنی استری خدیجہؓ کے پاس گئے اور کہا اگر تو چاہتی ہے کہ مرنے کے بعد تجھ کو لاکھوں روپیہ قیمت کے جڑاؤ زیور ملیں

اور تو ہمیشہ سکھ سے رہے تو ایک آدمی کو غلامی سے آزاد کرانے میں سہایتا کر اور پھر ساری کہانی غلام کی اور ابو سفیان کی سُنائی۔ بیوی خدیجہ رضؓ نے اُسی سمے ایک ہزار روپے مہادیالو کو دیدئے اور مہادیالو نے غلام کو خرید کر آزاد کر دیا۔ غلام نے آزاد ہوتے وقت کہا کہ ایشور تجھ کو بہت سے لونڈی غلام دے یہ سُنکر مہادیالو ہنسے اور کہا یہ نہ کہہ بلکہ یوں کہہ کہ ایشور مجھکو ایسی شکتی دے کہ میں سارے سنسار کو ہر غلامی سے ستنتر (آزاد) کرادوں۔

ابو سفیان کھڑا یہ تماشہ دیکھتا تھا اُس نے مہادیالو سے کہا لے محمدؐ میں نے سُنا تھا کہ تو بڑا بُدھی مان ہے مگر آج معلوم ہوا کہ تو بڑا مُورکھ ہے یہ ہزار روپے تو نے بیکار کھودئے۔ مہادیالو نے اُتر دیا میں ایسے مورکھ پن کو مہا بُدھی سمجھتا ہوں۔ اور تجھ سے بھی کہتا ہوں کہ تو بھی ایسا ہی مورکھ بن جا۔ تیرا دادا اور میرا دادا ایک تھا۔ جو بدھی تیری ہے وہی میری ہے۔ اور جو خون تیرا ہے وہی میرا ہے پر کیا کروں کہ تیرے لئے ایشور نے کچھ اور لکھا ہے اور میرے لئے کچھ اور لکھا ہے۔ تجھ سے اور تیری سنتان سے بڑے بڑے پاپ ہوں گے کیونکہ میں ہر چھپی بات کو جانتا ہوں اور ہر آنیوالی بات ہزاروں برس تک کی مجھے آج ہی دکھائی دے رہی ہے۔ ایشور نے یہ شکتیاں مجھے دی ہیں۔ ابو سفیان نے کہا کیا تو میری اولاد کا حال بھی جانتا ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ مہادیالو نے کہا "ہاں میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ تجھ کو بھی جو میرے سامنے کھڑا ہے اور تیری اولاد کو بھی جو ابھی دُنیا میں پیدا نہیں ہوئی۔ اُن کی تلواروں کو دیکھ رہا ہوں۔ اُن کے تیروں کو دیکھ رہا ہوں اُن کی برچھیوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اُن کے خنجروں کو دیکھ رہا ہوں۔ جو نردوشوں کو ماریں گے اور بھوک پیاس کا دکھ دے کر بیگناہوں کا خون بہائیں گے اس سمے نہ میں ہوں گا۔ اور نہ تو ہوگا۔ مگر میری اور تیری یہ بات موجود ہوگی

اور ایسا ہی ہوا کہ ابو سفیان تین چار دفعہ مہادیالو شری محمدؐ جی مہاراج اور مسلمانوں کو ایذا کے لئے فوجیں لے کر آیا اور خوب لڑائیاں ہوئیں۔ اور ابو سفیان کی بیوی نے مہادیالو کے چچا حمزہؓ کا کلیجہ چبایا۔ جبکہ اُحد کی لڑائی میں وہ قتل ہوگئے تھے۔ اور ابو سفیان کی بیوی ہندہ

کا راز آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کٹھ پتلی کا تماشا ہے۔ پتلیاں میدانِ حیات میں آتی ہیں۔ بولتی ہیں اپنا اپنا دکھڑا سناتی ہیں اور چھپ ہو جاتی ہیں اور آخر میں جب کٹھ پتلیوں کا تماشا ختم ہوتا ہے تو کہنے والا کہتا ہے ؎ یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور۔ اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

بادا حضرت نے میری باتیں سن کر ارشاد فرمایا، "ہاں قدسیہ سچ کہتی ہے، نہ تلوار کا راز کھلتا ہے نہ قلم کا۔ نہ رزم اپنی طلسم کشائی کرتی ہے نہ بزم اپنی آرائش کی پہیلی بوجھتی ہے۔ سورج نکلتا ہے اور چھپ جاتا ہے۔ چاند چمک دمک دکھاتا ہے اور غروب ہو جاتا ہے۔ ہوائیں چلتی ہیں آندھیاں آتی ہیں۔ اونچے اونچے درختوں کو گراتی ہیں۔ پامال شدہ خاک کو بازوؤں پر بٹھاتی ہیں اور ان لوگوں کی آنکھوں میں جوتیوں سمیت گھسی چلی جاتی ہیں جو اس خاک کو پامال کیا کرتے تھے۔ نسیم سحر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی آتی ہے اور سونے والوں کے کان میں کہتی ہے ؎

آشفتہ می دارد مرا زلفِ سمن بوئے کسے　　　ہر صبحدم روئے کسے ہر شام گیسوئے کسے

ذرا سننا آج ۱۸۵۶ء نہیں ہے بلکہ ستمبر ۱۸۵۷ء ہے۔ میں وہی قدسیہ شہنشاہ بہادر شاہ کی بیٹی ہوں مگر ویران اور سرگرداں پھر رہی ہوں۔ باپ کی حکومت کے انقلاب کے بعد دلّی سے نکلی در در کی ٹھوکریں کھائیں۔ جگہ جگہ کی خاک چھانی۔ گیروا کرتا پہنا سر پہ فقیرانہ رومال باندھا۔ گلے میں تسبیح ڈالی۔ "یا قدوس۔ یا قدوس" کا وظیفہ پڑھتی پھرنے لگی۔ لوگ پوچھتے تم کون ہو؟ کہہ دیتی: میں کوئی نہیں۔ بس جو کچھ ہے قدوس ہے۔ میرا مولا وہی زندہ ہے اور وہی قائم ہے۔ باقی جو کچھ دکھائی دیتا ہے سب فنا ہونے والا ہے۔ ایک کہتا یہ گلے میں منکا کیسا ہے؟ میں کہتی یہ میرے مَن کی ہار ہے جب تک تن مَن کرتی رہی ہارتی رہی۔ بے سہارے اور بے ٹھکانے پھرتی رہی۔ اب "تو ہی تو" کہتی ہوں تو ایک ٹھکانے پر آ گئی ہوں۔ کیوں بھائی؟ ایک ترازو میں دو پلڑے ہوتے ہیں ایک پلڑے میں مَن کا بٹہ رکھ دو اور دوسرے پلڑے میں بھی پورے ایک من کا بٹہ رکھ دو اور پھر دونوں من تولو تو بتاؤ۔ دو من تول میں ایک ہی مَن رہیں گے یا یا دو من ہو جائیں گے؟ نہیں بھائی تمہاری بھول ہے۔ دونوں من ترازو کی تول میں ایک ہی من رہیں گے۔ پس اگر تم چاہتے ہو کہ ہندوستان کے فنا ہونے والے شہنشاہ کی بیٹی سے اپنی زندگی کے دکھ دور ہونے کی نصیحت سنو۔ تو میں یہی کہوں گی کہ اپنے من کو مولیٰ سے لگا لو اور ذرا سر کو جھکا کر اپنی روح سے سنو وہ گا رہی ہوگی۔

"اپنے مولا کی میں جوگن بنی۔ جوگن بنی میں بروگن بنی۔ اپنے مولا کی میں جوگن بنی۔

بس مجھ قدسیہ کی اتنی ہی کہانی ہے اور اس کے بعد جو کچھ ہے وہ سب دھوپ چھاں

یا چاروں کی چاندنی ہے جو فانی ہے اور آنی جانی ہے میں شہنشاہ کے گھر میں پیدا ہوئی اور اب بھکارن ہوں
میں نے نہ پہلے کبھی غرور کیا تھا نہ اب کرتی ہوں کیونکہ غرور کا سر نیچا ہوتا ہے ۱۸۵۷ء کی باتیں سنکر ۱۹۳۷ء کے پوچھنے
والے پوچھتے ہیں اب کیا حال ہے ۱۸۵۷ء سے لیکر آجتک کیا کیا بیتی اور اس زندگی کے کیسے کیسے تماشے دیکھے؟ تو کہہ
دیتی ہوں سو برس سے زیادہ عمر ہو گئی۔ منہ میں دانت ہے نہ پیٹ میں آنت آنکھوں سے سوجھتا نہیں۔ ہاتھ پاؤں
قابو میں نہیں کیا کہوں کیا کیا گذری اور کیسی گذری غالبؔ نے کہا تھا "ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام۔ ایک
مرگِ ناگہانی اور ہے"۔ اس دنیا میں ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹۳۷ء تک ہندوستانیوں کی مروتیں بھی دیکھیں
اور بے مروتیاں بھی۔ وفائیں بھی اور بے وفائیاں بھی۔ سچ کہا ہے کسی شاعر نے ؎ کسی نے دل جو لیا تو لبھا
لبھا کے لیا۔ مگر حضور نے خنجر لگا لگا کے لیا۔ میں تو شروع سے مولا کی جوگن بن چکی تھی شادی بیاہ اور زندگی
کی بہاروں کو ماں باپ کی اور تاج و تخت کی سلامتی میں دل سے دور کر چکی تھی پھر بھی یہ پہاڑ سی عمر ایسی مصیبت
سے گذری ہے کہ بس دل ہی جانتا ہے قدم قدم پر حسد اور کینے کے کانٹے تھے اور پاؤں میں آبلے تھے" واہ کہنے کو جی چاہتا
بھی تھا تو منہ سے "آہ" نکلتی تھی کوئی کہتا اس خاندان کے اعمال اسکے سامنے آئے تو کہدیتی تھی۔ ہاں بھائی سچ ہے
بس خدا کسی کا وقت نہ لگائے۔ کوئی کہتا تھا یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ بہادر شاہ کی بیٹی نہیں ہے کھانے کمانے کیلئے بادشاہ کی
بیٹی بنتی ہے تو میں ٹھنڈا سانس لیکر کہدیتی تھی۔ ہاں میاں سچ کہتے ہو کیا کروں پیٹ بری بلا ہے۔ پیٹ کیواسطے
آدمی کو سبھی کچھ بننا پڑتا ہے۔ کوئی کہتا ستائے ہوؤں کو کیوں ستاتے ہو جنکے دل ٹوٹے ہوئے ہیں انکو کیوں چھیڑتے
ہو تو میں ہاں میں ہاں ملاتی تھی اور کہتی تھی ؎ نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی۔ تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں
ہم بیزار بیٹھے ہیں"۔ خلاصہ اس دکھ بھری زندگی کا یہ ہے کہ سات سات وقت فاقوں میں گذر گئے لوگ یہ سنکر
کہ بہادر شاہ کی بیٹی ہوں اپنے گھروں میں جگہ دیتے ہوئے ڈرتے تھے۔ درگاہوں میں۔ قبرستانوں میں یا
تکیوں میں بھوکی پیاسی پڑی رہتی تھی اور جانتی تھی کہ دنیا کے اسٹیج پر مجھے یہ پارٹ ادا
کرنا ہے۔ جب موت کا ڈراپ سین گرے گا تو نہ دکھ رہے گا نہ سکھ۔ نہ شاہی رہے گی نہ گدائی نہ
خار رہے گا نہ گل۔ بس ایک ہو کا میدان اور وہ بھی سنسان رہ جائے گا۔

تاریخ ختم ۲۸ جولائی ۱۹۳۷ء باقی رہے سدا نام مولا کا۔ کانا باتی ختم ہوئی۔